ساتواں باب

کچھ یار پرانے

یونیورسٹی میں آج کل کام بہت زیادہ تھا، وہ بہت تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا۔ سامنے لان میں بچے باغبانی کر رہے تھے۔ بچوں کو دیکھ کر تھکن جاتی رہی، وہ وہیں چلا آیا۔

''بچوں۔۔۔''قریب پہنچ پکارا، اُسے دیکھ کر سارے بچے بھاگ کے آئے اور اُس سے لپٹ گئے، وہ نیچے ہی بیٹھ گیا۔

''میرے جگر کے ٹوٹوں''اُس بچوں کو پیار سے بھینچے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگیں۔ اُس نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ نیوی بلیو رنگ کے لباس میں بل کھاتے بالوں کی پونی بنائے، پھولوں کے درمیان بیٹھی جزا، خود بھی ایک پھول ہی لگ رہی تھی۔

''انار کلی۔۔۔''دل ہی دل میں اُسے خطاب دیا۔ اُسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''تمہارے لان کی توڑ پھوڑ کا آج آخری دن تھا۔''مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

''سارے پھول لگ گئے؟''وہ بچوں کو موسم کی مناسبت سے پھول اور پودے لگانا سکھا رہی تھی۔ بچے بھی پوری دلجمعی سے یہ کام کر رہے تھے۔

''جی، سب ہو گیا۔۔۔''وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اُٹھ کر پاس رکھی کرسی پر جا بیٹھی، رضا بھی وہیں آ گیا۔

''بابا! یہ دیکھیں۔۔''ایک بچی نے اُسکے پاس آ کر اپنی رپورٹ کارڈ اُسکے سامنے کی۔ رضا نے اُسکے ہاتھ سے رپورٹ کارڈ لے لی۔

''اڑسٹھ فیصد مارکس۔۔۔ ہمم۔۔۔۔ بہت اچھے، تم نے پہلے سے اچھی کارکردگی دکھائی ہے رمشاء!''اُس نے اُسکے بال بگاڑتے ہوئے پیار سے کہا۔

''اگلی بار اس سے زیادہ لاؤں گی۔''اُس نے یقین دلایا۔

''ان شاء اللہ کہو''جزا نے فوراً ٹوکا۔

''ان شاءاللہ۔۔۔''اُس نے جلدی سے کہااور اندر بھاگی تاکہ جلداز جلد رپورٹ کارڈ اندر رکھ کر آئے تو باقی بچوں کے ساتھ کھیل میں شامل ہو سکے۔

''تم اچھی تربیت کر رہی ہو بچوں کی''اُس نے تعریف کی۔

''شکریہ۔۔۔''وہ مسکرائی۔ مسکراتی تھی تو اُسکی سیاہ آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ وہ سر جھکائے بچوں کا ہوم ورک دیکھنے لگی۔

''جزا!''اس نے اچانک ہی اُسے مخاطب کیا۔ایسے ہی۔۔۔بلاوجہ۔۔۔بات کرنے کی غرض سے۔۔۔

''ہوں؟''سر جھکائے جھکائے ہی، مصروف سے انداز میں کہا۔

''ایک بات پوچھنی تھی۔''اُس نے کہا۔

''پوچھو''کاجل سے بھری سیاہ آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔۔۔اور وہ بات ہی بھول گیا۔۔۔

''کہو؟ کیا کہنا تھا؟''اُس نے دوبارہ پوچھا تو وہ ہوش میں آیا۔

''کیا کہنا تھا مجھے؟''سر سہلاتے ہوئے یاد کرنا چاہا۔ وہ واقعتاً بھول گیا تھا۔

''ہاں! یاد آیا۔۔۔میں پوچھ رہا تھا کہ تم نے تعلیم کس چیز میں حاصل کی ہے؟''آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا، گو یا دوبارہ اپنی بات نہ بھول جائے۔

''اسپیشل ایجوکیشن''مختصر سا جواب دیا تو رضا نے سر ہلایا۔

''شروع سے ٹیچر بننے کا شوق تھا۔ بچپن میں اپنے دوستوں کی استاد بن کر اُنہیں پڑھانے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔ پھر جب وہ تنگ آکر مجھے چھوڑ کر چلے جاتے تب میں اپنے کھلونوں کو اپنا سٹوڈنٹس بنا لیتی تھی۔''وہ ہنستے ہوئے بتانے لگی۔ رضا مسکراتے ہوئے اُسے سننے لگا۔ وہ اپنے بچپن کا قصہ بڑے ذوق وشوق سے سنا رہی تھی۔ جاتی سردی کے دن آگئے تھے، وہ سوٹ کے ہم رنگ شال کندھوں پر پھیلائے بیٹھی تھی۔

بات کرتے ہوئے عادتاً چلتے ہوئے ہاتھ۔۔۔

مسکرانے پر چھوٹی ہوتی آنکھیں۔۔۔

کبھی رضا کے کسی سوال پر اٹھتی کاجل سے لبریز گہری سیاہ آنکھیں۔۔۔

دھوپ میں چمکتی سانولی رنگت۔۔۔۔

اور بس۔۔۔رضا ختم

"اب حقیقت میں استاد بن کر معلوم ہوا کہ اتنا آسان کام نہیں ہے یہ، جتنا بچپن میں لگتا تھا۔" اُس نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی، وہ بس مبہوت سا دیکھتا رہا۔

"تم نے رمشاء کو کم مارکس آنے پر کچھ کہا کیوں نہیں؟" اُس نے اچانک ہی سوال کیا۔

"کچھ کہنا چاہیے تھا کیا؟" اُس نے الٹا سوال کیا۔

"میرا مطلب، استاد یا والدین تو کم نمبر آنے پر کافی شدید رد عمل دیتے ہیں"

"بچے ہمارا شدید رد عمل سہنے کے لیے نہیں ہوتے جزا! صرف اس لیے کہ وہ ہماری اُمیدوں پر پورا نہیں اتر سکے۔ نمبرز تو ویسے بھی کسی کی قابلیت کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بڑوں کو بچوں پر اپنی نہ ختم ہونے والی اُمیدوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔"

"لیکن کیا والدین بچوں کے بھلے کیلئے نہیں کرتے یہ سب؟"

"کیا بچوں کی بھلائی اس میں ہے کہ اُنہیں کولھو کا بیل بنا دیا جائے اور صرف اپنی خواہشات کے پیچھے ہانکا جائے؟" اُس نے پوچھا تو جزا نے نفی میں سر ہلایا۔

"بچوں کی بھلائی زیادہ نمبرز لانے میں نہیں ہے۔ اُنکی بھلائی ایک اچھا اور بااخلاق انسان بننے میں ہے۔ اور اگر ہر بچہ ڈاکٹر اور انجینئر بن جائے گا تو وکیل کون بنے گا؟ پروڈیوسر کون بنے گا؟ نیوز اینکر کون بنے گا؟ ہر بچہ اپنی قابلیت کے حساب سے کام کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ بڑوں کو چاہیے کہ بچوں کی صلاحیتوں کو نکھاریں، نہ کہ اُنہیں نمبروں کے پیچھے بھگایا جائے۔"

"تم بہت مختلف سوچتے ہو۔" تمام باتوں کے جواب میں اُس نے بس اتنا ہی کہا تو وہ مسکرا دیا۔

''مختلف مطلب؟''اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یعنی تم انہیں کسی بھی بات پر ڈانٹتے نہیں ہو، غصّہ نہیں کرتے''

''کس نے کہا کہ میں غصّہ نہیں کرتا؟''اُس نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟ کرتے ہو کیا؟''وہ حیران ہوئی۔اُسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔کوئی بچہ دروازہ کھولنے جا چکا تھا۔

''کرتا ہوں۔۔۔بس بچوں پر نہیں کرتا۔۔۔''اُس نے چہرہ گھما کر بچوں کو دیکھا۔

''جزا! پتہ ہے اللہ کے نبی ﷺ نے بچوں کو ریحان اللہ یعنی اللہ کا پھول کیوں کہا تھا؟ کیونکہ بچے واقعی جنت میں رکھنے کی شے ہیں۔یہ اتنے معصوم ہیں کہ یہ دنیا انکے لائق نہیں لگتی مجھے۔انکے لیے صرف جنت ہی ہونی چاہیے۔اسی لیے اگر نابالغ بچہ مر جائے، تو وہ جنت میں ہی جاتا ہے، بنا کسی حساب کتاب کے''وہ محبت پاش نظروں سے بچوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''رضا بھائی!۔۔۔''ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا وہاں آیا۔

''ہاں کہو!۔۔۔''وہ اُسکی جانب متوجہ ہوا۔

''فریحہ آنٹی آئی ہیں۔''اُس نے اطلاع دی۔

''کہاں؟''وہ حیران ہوا۔اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک طرحدار اور خوبصورت خاتون وہاں داخل ہوئی تھی۔بلیو جینز پر ریڈ شرٹ پہنے، بالوں کا میسی سا جوڑا بنائے، چہرے کے گرد آتی لٹوں کو کرل کیا ہوا تھا۔کانوں میں بڑے بڑے سے گول آویزے لٹکائے وہ جو کوئی بھی تھی، بلاشبہ بہت ہی خوبصورت تھی۔

اُسے دیکھ کر رضا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔اور جزا نے دیکھا تھا، اُس عورت کو وہاں دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوشگوار حیرت پھیلی تھی۔

''ہیلو رضا! کیسے ہو؟''اُس نے ٹیبل پر اپنا پرس رکھتے ہوئے کہا۔اخلاقاً اُسے بھی سلام کیا اور دوبارہ رضا کی جانب متوجہ ہوئی۔

''کافی دنوں بعد نہیں آئی تم؟''رضا نے شکوے کے سے انداز میں کہا۔

''مت شرمندہ کیا کرو مجھے، جانتے تو ہو کتنی مجبور ہوں میں۔۔۔''اُس نے کہا تو رضا کے چہرے پر افسوس جیسے تاثرات آئے۔

''میں سمجھ سکتا ہوں۔''اُس نے دکھ سے کہا۔اُن کے درمیان کافی سے زیادہ شناسائی لگتی تھی۔

''اچھا مجھے تم سے ایک ضروری بات بھی کرنی تھی۔''فریحہ نے کہا۔

''ہاں! کیوں نہیں؟ جزا! کیا تم اندر سے ولید کو لے آؤ گی؟''اُس نے پہلے فریحہ کو جواب دیا پھر جزا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ولید کو؟''اُس نے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''ہاں! ولید کو۔''اُس نے دہرایا

''ٹھیک ہے۔''وہ سنجیدگی سے کہتی اُٹھ گئی۔اُسکے جانے کے بعد وہ دونوں آہستہ آواز میں کچھ بات کرنے لگے۔صاف ظاہر تھا کہ جزا کو وہاں سے ہٹانا چاہتے تھے۔پتہ نہیں اُسے کیا برا لگا تھا؟ رضا کا اُسے وہاں سے جانے کو کہنا یا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اُس عورت کی طرف متوجہ ہو جانا؟ وہ خاموشی سے اندر آ گئی۔

----------+---------+--------

''مجھے روٹیاں لینے جانا ہے۔اور اس وقت میرے پاس کھلے پیسے نہیں ہیں۔''وہ صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا موبائل استعمال کر رہا تھا، جب اُسکے بھائی نے اُسکے پاس آ کر کہا۔

''تو مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''موبائل سے نظریں ہٹائے بنا پوچھا۔

''پیسے چاہیے ہیں مجھے''اُس نے اُسکے سر پر کھڑے ہو کر زور سے کہا تو حسین نے اُسے گھورا۔

''نہیں ہیں میرے پاس۔۔۔''

''یار!۔۔۔کس قدر کنجوس انسان ہو تم؟ واپس کر دوں گا میں'' اُسکے بھائی نے لتاڑا۔

''قسم لے لو مجھ سے، ایک روپیہ نہیں ہے۔چاہو تو میرا والٹ دیکھ لو''حسین نے بیچارگی سے کہا۔اُسکے بھائی نے واقعی اُسکا بٹوہ اٹھا لیا۔

''ارے! اس میں تو سچ میں پیسے نہیں ہیں۔''اُسکا خالی بٹوہ دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''میں نے فارسی زبان میں کہا تھا؟ میں نقد رقم رکھنا چھوڑ چکا ہوں''اُس نے بیزاری سے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''حور کی وجہ سے''جواب آیا۔کچن میں اپنے بچے کے لیے دودھ گرم کرتی حور عین کے کان کھڑے ہوئے۔

''حور کی وجہ سے؟ کیوں؟''اُسکا بھائی حیران ہوا۔

''میری جیب میں ایک روپیہ نہیں چھوڑتی یہ عورت، پہلے تھوڑے سے پیسے غائب ہوتے تھے، میں سمجھتا تھا کہ شاید میرے حساب کتاب میں گڑ بڑ ہے۔ پھر پورے کے پورے پیسے غائب ہونا شروع ہوئے، تو تب معلوم ہوا کہ کہاں جا رہے ہیں سارے پیسے۔۔''اس الزام پر تو حور عین بلبلا اٹھی۔سب چھوڑ چھاڑ اُسکے سر پر پہنچی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ رکھتے ہی کتنا ہو تم اپنی جیبوں میں؟''

''جتنا بھی رکھتا ہوں حور عین بی بی، لیکن وہ آپ کے لیے ہر گز نہیں ہوتا تھا۔''ہاتھ نچا نچا کے لڑاکا عورتوں کی طرح کہا تو اُسکے بھائی نے اپنی ہنسی ضبط کی۔

''میں نے مشکل سے ایک آدھ بار ہی نکالا ہو گا۔اور دیکھو ذرا اِسکو! ایسے رو رہا ہے جیسے پتہ نہیں گردہ نکال کے بیچ دیا ہو اِسکا۔۔''

''وہ دن بھی دور نہیں ہے جب تم میرا گردہ نکال کر بیچ رہی ہو گی، وہ بھی اپنے کسی آنلائن آرڈر کیے ہوئے پارسل کی پاداش میں۔''

''ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد پہلا کام یہی کروں گی''اُس نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''شرم تو نہیں آ رہی ہو گی؟ میری عیدی بھی یہ کھا جاتی ہے ساری۔۔۔''اُسکے دکھ ہی نہیں ختم ہو رہے تھے۔

''جی نہیں! تم خود ہی اِدھر اُدھر رکھ کر بھول جاتے ہو۔''اُس نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے کہا۔اب شکل سے چوری صاف ظاہر تھی تو چھپانا بھی تو تھا نہ۔۔۔

''اپنے گھر کے ڈریسنگ ٹیبل پر یا دراز میں رکھنے کو تم یہاں وہاں رکھنا کہتی ہو؟اظفر چچا کی سلامی میں دی گئی رقم بھی نہیں ملی آج تک مجھے، وہ بھی یہ کھا گئی۔اور تو اور، ہمارے درمیان یہ فیصلہ ہوا تھا کہ عید پر بچوں کو ملنے والی عیدی کو آدھا آدھا بانٹیں گے۔ لیکن وہ بھی اس نے ساری کی ساری رکھ لی۔''اُسکی داستان واقعی دکھ بھری تھی۔

''میں جا رہا ہوں روٹی لینے، تم دونوں کرتے رہو یہ حساب کتاب''اُسکا بھائی اُکتا کر کہتا وہاں سے چلا گیا۔

''ذرا سی۔۔۔''حسین کے قریب آتے ہوئے ہاتھوں کی چٹکی بنا کر اُسکے چہرے کے سامنے کی''ذرا سی تم اپنے گھر والوں کے سامنے، میری عزت نہیں رکھ سکتے۔''

''میرے گھر والوں کو تمہاری اصلیت پتہ ہے۔''منہ موڑ کر دوبارہ موبائل میں مصروف ہو گیا۔

''اچھا سنو! نیچرلز سیریز کا ایک اور پارٹ آگیا ہے۔''اُس نے رازداری سے بتایا۔

''واقعی میں؟مجھے کیوں نہیں پتہ چلا؟''وہ حیران ہوا۔

''تمہیں دیکھنا ہے؟''

''آف کورس! یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟''

''ٹھیک ہے، پھر تم برگر آرڈر کردو۔میں ابھی بچوں کو سلا کر آتی ہوں''وہ اُسے آرڈر دے کر یہ جا وہ جا ہو گئی۔

''مجھے کسی دن سچ میں اپنے گردن بیچنے پڑیں گے۔''پیچھے سے اُس نے ہانک لگائی جسے وہ سنی ان سنی کرتی اندر جا چکی تھی۔وہ بڑبڑاتے ہوئے موبائل نکال کر برگر آرڈر کرنے لگا۔

----------+---------+--------

''کیا ہو رہا ہے؟''خاکی پینٹ پر کالی شرٹ ٹک ان کیے نوید کچن میں داخل ہوا تھا۔

''تم کیوں آگئے؟''اُسے دیکھ کر بشریٰ چیخ اٹھی۔

''کیا مطلب کیوں آگیا؟''وہ حیران ہوا۔

''میں نے تمہارے لیے ناشتہ سرپرائز رکھا تھا۔ تم نے سب خراب کر دیا'' وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب، تم میرے لیے کچھ خاص بنا رہی تھیں۔'' وہ خوش ہوا۔

''ہاں! اب تو تم نے خراب کر دیا۔'' وہ ناراض ناراض سی بولی۔

''تو مجھے معلوم تھوڑی ہے کہ تم نے کیا بنایا ہے؟ سرپرائز تو اب بھی برقرار ہے۔'' اُس نے اُسکی ناراضگی کم کرنی چاہی۔

''ایسے نہیں! میں ٹیبل پر اچھے سے سجانے والی تھیں۔ تم کسی دن دیر سے نہیں اُٹھ سکتے۔ الو کی طرح صبح صبح اٹھ کر بیٹھ جاتے ہو۔'' ناراضگی سے بولتی آج وہ برسوں پرانی بشریٰ لگ رہی تھی، نوید کو وہ اچھی لگی۔

''آپکی اطلاع کے لیے الو صبح نہیں جاگتا، رات کو جاگتا ہے۔ اور چلو میں آنکھ بند کر لیتا ہوں تم میز سجالو'' اُس نے مشورہ دیا تو بشریٰ نے اُسے گھورا۔

''اچھا اچھا! جیسے تمہیں صحیح لگے ویسے کر لو'' مسکراتے ہوئے صلح جو انداز میں کہا۔ تو وہ پلٹ کر پلیٹوں میں ناشتا لگانے لگی۔

''ویسے کیا بنایا ہے تم نے میرے لیے؟'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''حلوہ پوری، اور سالن'' اُس نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

''صبح صبح اتنی محنت کس خوشی میں بیگم صاحبہ؟'' اُس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے لیے۔۔'' اُس نے ٹیبل پر ناشتہ لگاتے ہوئے کہا۔ نوید نے غور سے اُسے دیکھا، باوجود اسکے کہ وہ نوید سے چند سال ہی چھوٹی تھی۔ لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ کم عمر لگتی تھی، چہرے پر معصومیت ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔

لیکن یہ معصومیت نوید کو چار سال پہلے تک کیوں نظر نہ آتی تھی؟ یہ چہرہ اُسے پہلے کیوں اچھا نہ لگتا تھا؟

ان سوالات کے ذہن میں آتے ہی اُسکی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا، اور وہ آگے نکل چکے تھے۔ چاہ کر بھی واپس نہیں لوٹا جا سکتا تھا۔ بشریٰ مگن سی میز پر ناشتہ لگا رہی تھی یہ دیکھے بنا کہ نوید کے چہرے پر حزن، کرب اور پچھتاوے کا ایک جہاں آباد ہے۔

----------+---------+--------

قسمت، مقدر اور تقدیر۔۔۔

ان تین لفظوں سے بنے دائرے کے گرد ہی انسان کی زندگی گھومتی رہتی ہے۔ انسان جو چاہتا ہے ویسا ہوتا نہیں، جو سوچتا ہے وہ کر نہیں پاتا اور جو تصوّر بھی نہیں کیا ہوتا، وہ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

حسین مرتضیٰ بھی قسمت کے ایسے ہی کھیل کو اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کی دوڑ دھوپ میں جن لوگوں کو اُس نے یاد بنا کر بھلا دیا تھا، وہ اُسکے سامنے تھے۔ سب کے سب۔۔۔ نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔

گزرے وقتوں میں دل میں یہ خیال کئی بار جاگا تھا کہ اپنے یاروں کو اکھٹا کرے، اُنکے شکوے ختم کرے، ناراضگیاں دھو دے اور پھر سے دوست بنا لے۔

دوست اکھٹے ہو گئے تھے۔ حسین مرتضیٰ کی یہ دیرینہ خواہش پوری ہو چکی تھی۔ لیکن جنہیں وہ ناراضگیاں سمجھ رہا تھا کیا وہ واقعی ناراضگی ہی تھی؟ دلوں میں شکوے ہی تھے یا نفرتیں ڈیرہ جما چکی تھیں؟

یہ ملاقات اُسکے لیے متوقع تھی۔ پرسوں فرّخ صاحب نے پچھلے تمام واقعات کی تفصیل اُسکے گوش گزار کر دی تھی۔ ہر شے اسکے لیے پہلے سے بڑھ کر ناقابلِ یقین تھی۔ آج کے بارے میں بھی وہ جانتا تھا کہ سب وہاں موجود ہوں گے۔ لیکن دس سال بعد اپنے دوستوں کو سامنے دیکھنے پر اُسے بے انتہا دکھ ہوا تھا۔ اُسکے دوست بدل گئے تھے۔۔۔ بہت بدل گئے تھے۔

ہاں! حسین اُنہیں اب بھی دوست ہی سمجھتا تھا۔ گزرے ماہ و سال میں اُس نے جب بھی انہیں یاد کیا تھا، دوست کہہ کر ہی یاد کیا تھا۔ اور اب وہ انہیں ایسے نہیں دیکھ پا رہا تھا، اُنکے ساتھ ہوتے بھی جو موت جیسی خاموشی یہاں چھائی ہوئی تھی، اُسے وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ عمر جس کا چہرہ ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا، آج اُس سے تھوڑے فاصلے پر، چہرے پر گہرا کرب و دکھ لیے بیٹھا تھا۔ وہ مقدّم جو کبھی اُسکے ساتھ مل کر محفل کشتِ زعفران بنا دیتا تھا، وہ زمانے بھر کی تھکن خود میں سموئے چپ تھا۔ وہ نوید جو سب سے خوش اخلاق تھا، چٹانوں جیسی سختی کے ساتھ کسی فائل کی ورک گردانی کر رہا تھا۔ وہ علی، جو جذباتی تھا، آج اتنی نفرت لیے کسے دیکھ رہا تھا؟ علی کی نظروں کے تعاقب میں اُس نے دیکھا۔ سامنے رضا بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں اُسے دیکھ کر چہرے پر عجیب سی مسکان کیوں آئی تھی؟ مسکراتے ہوئے اُسکے

چہرے پر گڑھے پڑے تھے۔ رضا کو جس حالت میں وہ چھوڑ کر گیا تھا، وہ ویسا بلکل بھی نہیں رہا تھا۔ اُسے جانچنے کے لیے بس ایک نظر ہی کافی تھی۔ اُس نے سر جھکا لیا۔

سفید ٹراؤزر پر سفید پوری آستینوں کی شرٹ پہنے اور اُس پر سفید رنگ کا شرگ ڈالے جسکے کنارے پر کالی پٹی لگی تھی، کہنیوں تک آستینیں چڑھائے، سر جھکائے بیٹھا حسین مرتضیٰ، یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں بیٹھے ہر شخص کی اُسکے بارے میں ایک ہی رائے تھی۔

حسین نہیں بدلا تھا۔۔۔ بلکل نہیں بدلا تھا۔ اُسکی ہنسی آج بھی اتنی ہی معصوم تھی، جتنی دس سال پہلے، اُسکا چہرہ آج بھی ویسا ہی کھلتا ہوا تھا، جیسا کہ دس سال پہلے۔ پہلے وہ نوجوان لڑکا تھا، پر چہرے پر ہلکی داڑھی رکھے، بال سیٹ کیے، آنکھوں پر ریم لیس گلاسز لگائے، آج وہ ایک ڈیسنٹ مگر بھرپور مرد تھا۔

سر جھکائے بیٹھے حسین کو اچانک ہی کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ علی آنکھوں میں نفرت لیے بھلا کسے دیکھ رہا تھا؟ اُس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

وہ دنیا جہاں کی نفرت چہرے پر سجائے رضا کو براہ راست دیکھ رہا تھا۔ اُسکی نظریں عجیب سی تھیں، حسین کو لگا کہ وہ اکیلا ہی ہے جس نے ایسا محسوس کیا تھا لیکن ایسا نہ تھا۔

مقدّم اور عمر بھی اس وقت نا سمجھی سے علی کو ہی دیکھ رہے تھے۔ رضا موبائل میں ہی مصروف تھا، لیکن اُسکے اضطرابی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی اُس کی چبھتی نظریں خود پر محسوس کر رہا ہے۔ اس سارے معاملے میں اگر کوئی واقعی لاعلم تھا تو وہ نوید تھا، وہ حقیقتاً اس وقت بہت غور سے کسی فائل کو پڑھ رہا تھا۔

مقدّم نے عمر کی جانب دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ اُس نے نا سمجھی سے کندھے اُچکائے۔

تم ہی بتاؤ کہ آخر اور کیا تعلق ہے تمہارا اُس سے؟ جس تعلق کی قیمت تم ہم سے مانگ رہے ہو۔

رضا کی آواز علی کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

وہ ماضی میں rehab سینٹر میں رہ چکا ہے، نشے کے علاج کیلئے۔۔۔

الفاظ اُسکے ارد گرد بھنورے کی طرح چکّر کاٹ رہے تھے۔

ڈرائیور کی بیٹی؟ واقعی؟۔۔۔ ہر کسی سے جواب طلب کر رہے ہو نہ تم؟ چلو اب تم بتاؤ! کیوں اہم ہے وہ لڑکی تمہارے لیے اتنا؟

رضا کے زہر میں ڈوبے الفاظ آج بھی اُسکا جگر چھلنی کرنے پر قادر تھے۔

کافی لمبا علاج چلا ہے اسکا، عادی نشئی تھا یہ۔۔۔

اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہاں ایک نہیں دو دو شکار ہیں۔

رضا الٰہی اس سے ڈرگز خرید تا تھا۔ کافی پرانے تعلقات ہیں ان دونوں کے۔۔۔

ہر شے گڈ مڈ ہو رہی تھی۔ علی کی نظریں اُس پر تھیں لیکن دماغ مسلسل پرانی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

بلآخر رضا نے موبائل بند کر کے میز پر رکھا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے براہ راست اُسکی آنکھوں میں دیکھا، علی کے انداز میں کوئی فرق نہ پڑا۔

''کوئی کام ہے مجھ سے؟'' سیدھا سیدھا سوال کیا۔

''ہاں! بہت ضروری۔۔۔'' چبا چبا کے جواب دیا گیا تھا۔ وہاں بیٹھے ہر فرد کی سانسیں اٹکی تھیں۔ اُن دونوں کا انداز ہی کچھ ایسا تھا جیسے پرانے حریف سامنے بیٹھے ہوں۔ نوید نے اب کہ فائل سے سر اٹھا کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن دونوں کو دیکھا۔

''میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔'' زہر خند لہجے میں کہتے طنز میں ڈوبی مسکراہٹ اُسکی طرف اچھالی تھی۔ ماحول عجیب سے تناؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ یہ جو بھی گفتگو اُنکے درمیان ہو رہی تھی، اُسے اُن میں سے کسی کا دماغ اب تک پروسیس نہیں کر سکا تھا، اُنکے لیے یہ حیران کن تھا۔

''تم واقعی میرے کسی کام نہیں آسکتے۔'' اُس سے بھی زیادہ زہر خند لہجے میں جواب دیا گیا۔ رضا نے مزید طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ آبرو اُچکائے تھے، جیسے اُس سے اسی جواب کی اُمید ہو۔

''لیکن تم مجھے یہ ضرور بتاؤ گے کہ تم اس مجرم خلیل کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟'' علی کے اگلے جملے پر جہاں رضا کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی، وہیں نوید ایسے کھڑا ہوا تھا جیسے اُسے کرنٹ لگا ہو۔

''کیا کہہ رہے ہو یہ تم؟'' رضا کے بجائے سوال نوید کی جانب سے آیا تھا۔

''یہ تم اس سے پوچھو۔ جب تم اس قاتل کو ہر جگہ تلاش کر رہے تھے، تب یہ اُسکے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔'' اس بات پر رضا کرسی دھکیل کر کھڑا ہوا تھا۔

''بہتر نہیں ہو گا کہ تم اپنی بکواس بند رکھو'' اُس نے غصّے سے کہا۔ علی بھی کرسی دھکیلتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ اُن دونوں کو اس طرح آمنے سامنے دیکھ باقی تینوں بھی تقریباً کھڑے ہو چکے تھے۔ نوید موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے دونوں کے درمیان آیا۔

''ایک سیکنڈ۔۔۔ رک جاؤ علی!۔۔۔ تمہیں یقیناً کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے'' نوید نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی ہے، لیکن تم سب ضرور بیوقوف بن رہے ہو۔ تصاویر دیکھ سکتے ہو تم۔'' اُس نے کہا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، رضا الٰہی پرسوں ایک ریسٹورونٹ میں خلیل سے ملے تھے۔ یہ تصاویر بھی مجھے دی ہیں انہوں نے۔ فلحال میں اس پر تفتیش کر رہا ہوں۔'' پیچھے کب سے خاموش کھڑے شیراز نے جواب دیا، تو اب کہ ہر شخص نے بے یقینی سے رضا کو دیکھا تھا، جو ماتھے پر بل ڈالے خاموش ہی کھڑا تھا۔

''ٹھیک ہے! تم جاؤ یہاں سے۔'' نوید نے شیراز کو اشارہ کیا تو وہ اپنی ٹیم کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کمرے میں اب بس وہ چھ تھے۔

''کیا تم اُس سے ملے تھے رضا؟'' نوید نے تحمل سے پوچھا۔

''کیا میں تمہیں جواب دہ ہوں؟'' اُس نے بڑے ہی سکون سے پوچھا تھا۔ نوید کے تو سر پر لگی تلوؤں پر جا بجھی۔

''تم ہم سب کو جواب دہ ہو رضا! وہ ہمارا مشترکہ مجرم ہے۔'' سخت غصّے کے باوجود بھی نوید نے بہت ضبط سے اُس سے پوچھا تھا۔

''یہ موضوع جس نے شروع کیا تھا، جواب بھی اُسی سے طلب کرو۔'' اُسکے سکون میں رتی بھر فرق نہ آیا۔

''نہیں بتائے گا یہ۔۔۔ تمہیں پوچھنا بھی نہیں چاہیے، کیونکہ ایک مجرم کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینااور اِس بات سے ہمیں بے خبر رکھنا، بذاتِ خود ایک جرم کے سوااور کچھ نہیں ہے۔''زہر خند لہجے میں کہتے علی کے الفاظ پر رضا ہنسا تھا۔اُسکی یہ ہنسی سوائے طنز کے اور کچھ نہ تھی۔

''علی رکو! ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے اُس سے ملا ہو۔''عمر نے معاملہ سنبھالنا چاہا۔

''اگر کوئی وجہ ہے تو اُسے بتانی چاہیے، ہم اِس پر شک نہیں کر رہے لیکن، جاننا ہمارا حق ہے''نوید نے سنجیدگی سے کہا، جواباً وہ بھی ڈھیٹ بنا خاموش کھڑا رہا۔

''شک؟ ہم شک کر بھی نہیں سکتے، علی کو بھی تھوڑا تحمل سے بات کرنی چاہیے۔''مقدّم کو اُسکا انداز بھی برا لگا تھا۔اِس سارے معاملے میں اگر کوئی خاموش کھڑا تھا تو وہ حسین تھا۔

''اگر تم یہ بات جانتے کہ یہ شخص اپنے شوق کے لیے اُس مجرم سے نشہ خریدتا تھا۔ تو کبھی بھی میرے شک کو غلط نہ سمجھتے۔''اُس کے نفرت میں ڈوبے الفاظ پر وہاں سکتا چھا یا تھا۔ نوید جھٹکے سے اُس کی جانب گھوما اور اُسکے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اُسے پیچھے کرتے ہوئے بولا۔

''علی! خاموش رہو۔''اُسکی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کوئی تنبیہہ! جیسے وہ کچھ جانتا ہو۔ رضا نے جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے اور براہ راست اُسکی آنکھوں میں دیکھا، وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ علی آج کس حد تک جا سکتا ہے؟ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اُسکی نفرت میں کتنا گر سکتا ہے۔ کتنا؟

''کیوں؟ کیا تم ایسے آدمی پر بھروسہ کرنا چاہتے ہو جو ڈرگ ایڈکٹید (عادی نشئی) ہے؟ جسکے مجرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔''رضا اُسی طرح سخت تاثرات کے ساتھ کھڑا رہا تھا۔ نشہ، ڈر گز، مجرم۔۔۔ تمام الفاظ ہتھوڑے کی طرح اُسکے دماغ پر لگ رہے تھے۔ اُس نے آج اُسکی ذات کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔

''خاموش ہو جاؤ علی!۔۔۔''نوید نے سختی سے کہا، گفتگو اب غلط سمت جا رہی تھی۔ وہ رضا کی جانب مڑا۔''ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔''نوید نے فلوقت معاملہ رددفع کرنا چاہا تھا۔

''ہم اس بارے میں ابھی ہی بات کریں گے نوید! اور سب کے سامنے'' اس آواز پر جو جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ چہرہ موڑ کر سب نے دروازے کی جانب دیکھا۔ قدم قدم چلتے فرّخ صاحب اُنہی کی طرف آرہے تھے۔ اُن سب پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ اپنی سربراہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ پیچھے شیراز بھی اپنی ٹیم کے ساتھ واپس آچکا تھا۔

''بیٹھ جاؤ!'' اُنہوں نے اشارے سے کہا تو سب اپنی اپنی نشستوں پر واپس بیٹھے۔

''رضا، خلیل سے ملا تھا۔۔۔ میرے کہنے پر۔۔۔'' یہ وہ بم تھا جو رضا کے علاوہ ہر شخص پر گرا تھا۔ حتیٰ کہ نوید پر بھی۔

----------+---------+--------

آخری بریفنگ کی رات:

بریفنگ ختم ہو چکی تھی، وہاں سے نکلنے میں پہل علی نے کی تھی۔ اُسکے پیچھے عمر اور مقدّم بھی وہاں سے نکل گئے تھے، نوید کسی دوسرے کمرے میں جا چکا تھا۔ رضا بھی بس نکلنا چاہتا ہی تھا کہ

''رکو رضا!'' فرّخ صاحب نے اُسے روکا۔

''جی؟'' وہ حیران ہوا۔

''بیٹھو! تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اُنہوں نے اشارہ کیا تو وہ واپس بیٹھ گیا۔

''تم اس شخص کو جانتے ہو؟'' اُنہوں نے پیچھے سکرین پر نظر آتے خلیل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے ایسا لگ تو رہا ہے کہ میں اِسے جانتا ہوں لیکن اس وقت یاد نہیں آرہا'' اُس نے صاف گوئی سے کہا۔

''میری بات تحمل سے سننا۔ تم لوگوں کے بارے میں تمام معلومات ڈیپارٹمنٹ والوں کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ماضی میں تم خلیل سے ملتے رہے ہو۔ ڈرگز کے سلسلے میں۔۔۔'' آخری جملہ اُنہوں نے سرسری سے انداز میں کہا تو رضا کے پیروں تلے زمین نکلی۔ وہ اُسکا چہرہ غور سے دیکھ رہے تھے، وہاں عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

''وہ میرا ماضی تھا۔'' آہستہ آواز میں بس اتنا ہی کہا۔ کسی کو بھی اپنی ذات کے حوالے سے وضاحت دینا بہت مشکل کام تھا۔

''میں جانتا ہوں، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایک ذمے دار شہری ہو۔ تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد کچھ اور ہے۔'' وہ رکے، رضا کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

''ہم خلیل کے ذریعے مائیکل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اور اس میں تمہاری مدد درکار ہے۔''

''میری؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں! تمہیں اُس سے ملنا ہوگا۔'' اُنہوں نے سنجیدگی سے کہا اور پھر رضا کو تفصیل سے سب بتانے لگے۔

----------+---------+--------

دو دن پہلے:

''تُو تو بدل گیا ہے یار! کپڑے دیکھ اپنے۔۔۔ صاحب لگنے لگا ہے۔ کہاں سے کمایا اتنا مال؟'' اُسکے سامنے بیٹھا خلیل اُسکی رعب دار شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ رضا بس مُسکرا کر رہ گیا۔

''میں تو پہچان بھی نہیں سکا تُجھے، سچ سچ بتا۔۔۔ حرام کا پیسہ ہے نہ؟ کہاں سے کمایا تُو نے؟'' خلیل کی بات پر رضا کا دل کیا کہ اُسکا منہ نوچ لے لیکن فلحال اُسے اپنا فرض پورا کرنا تھا۔

''تم کمانا چاہتے ہو اتنے پیسے؟'' اُس نے اُسکی کمزوری پر وار کیا۔

''کون نہیں کمانا چاہتا؟ اور میں تو ویسے بھی آج کل بڑا غریب چل رہا ہوں۔''

''تو پھر وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ دیکھو! میرے پاس بہت مال ہے۔ لیکن اُسے بیچنے کے لیے کلائنٹ (گاہک) نہیں ہے۔'' رضا نے آگے ہوتے ہوئے رازداری سے کہا۔

''مال؟'' پہلے تو وہ سمجھا نہیں، لیکن جب سمجھ آیا تو وہ بھی سیدھا ہو بیٹھا۔

''اوہ اچھا! وہ مال۔۔۔ تو تم ڈرگز بیچنا چاہتے ہو؟'' اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں! اور میرے پاس اس مرتبہ کافی مہنگا مال ہے۔ یہ عام سے سڑک چھاپ چرسیوں کے لیے نہیں ہے، کروڑوں کا مال ہے۔ مجھے ایک گاہک چاہیے جو اسکی زیادہ سے زیادہ قیمت لگا سکے''

''گاہک تو بہت ہیں ایسے، لیکن تم مجھے کیا دو گے؟''

''ساری کمائی کا چالیس فیصد''

''چالیس فیصد؟'' اُسکی رال ٹپکی۔

''ہاں! اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ تم مجھے کتنا مہنگا گاہک لا کر دیتے ہو۔ جتنا زیادہ منافع ہو گا اتنا ہی زیادہ تمہیں فائدہ ہو گا'' رضا نے مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی لبوں سے لگالی۔ وہ تھوڑی کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

''ایک بندہ ہے، جسکے لیے میں کام کرتا ہوں۔ بہت امیر انسان ہے۔ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ امیر، وہ یہی سارے کام کرتا ہے''

''کون؟''

''نام تو میں نہیں جانتا لیکن اُسکا اسسٹنٹ مجھ سے ہمیشہ ملتا ہے۔ فرمان نام ہے اُسکا۔''

''فرمان؟'' رضا نے آنکھیں چھوٹی کر کے سوچنے والے انداز میں دیکھا۔

''یہ نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔'' صاف جھوٹ بولا۔

''وہ اپنے مالک کے لیے کروڑوں تو کیا، اربوں کی ڈیلنگ کرتا ہے۔ اگر میں اُسے تمہارا سارا مال دوں تو وہ بخوشی خریدنے پر راضی ہو گا۔'' اُس نے پر جوش ہوتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں اُس سے خود ملنا چاہوں گا''

''کیا مطلب؟''

''فکر مت کرو تمہارے پیسے کہیں نہیں جائیں گے۔ تم سے جسکا وعدہ کیا ہے، وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ لیکن اُس فرمان سے میں خود ملنا چاہتا ہوں''

''لیکن وہ ہر کسی سے نہیں ملتا۔''

''تو پھر چھوڑ دو، مجھے نہیں کرنا یہ سودا۔'' وہ کھڑا ہونے لگا۔

''اچھا رکو! میں فرمان سے بات کر کے تمہیں بتاؤں گا۔ اگر وہ ملنے پر راضی ہو گیا تو پھر تمہیں اُسکی بتائی ہوئی جگہ پر آنا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے! جلد از جلد اُس سے بات کر کے مجھے بتاؤ۔ میں انتظار کروں گا'' رضا نے کہا اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ پیچھے بیٹھا خلیل فون نکال کر فرمان کو کال کرنے لگا۔ آس پاس کی ٹیبل پر گاہکوں کی صورت میں موجود سی ٹی ڈی کے جوان اُسکی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

--------+---------+----------

''رضا نے کامیابی حاصل کی، اگلے ہی دن خلیل نے اُسے فون کر کے فرمان سے ملاقات کا وقت اور جگہ طے کی اور اب ہم اسی جگہ سے دونوں کو گرفتار کریں گے۔ بہت جلد۔۔۔'' فرّخ صاحب نے گفتگو سمیٹی۔ رضا ویسے ہی سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ سامنے بیٹھا نوید بے چینی سے پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔ علی ساکت تھا۔ باقی سب کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

''آپ نے مجھے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟'' نوید نے پوچھا۔

''تم کب سے مجھ سے سوال کرنے لگے نوید؟'' اُنھوں نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ شرمندہ ہوا۔

''سوری۔۔۔''

آج کی بریفنگ ختم ہوتی ہے۔ اگلی مرتبہ مجھے اُمید ہے کہ، ہم کسی منطقی انجام تک پہنچ چکے ہوں گے۔'' وہ کاغذات سمیٹتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے چلے گئے۔ نوید نے چہرہ موڑ کر رضا کو دیکھا، کچھ کہنا چاہتا تھا شاید! لیکن وہ کچھ بھی کہے، سنے بنا خاموشی سے

وہاں سے چلا گیا۔ علی فلحال کسی سے بھی نظریں ملائے بنا اپنی چیزیں اٹھا رہا تھا۔ حسین کی برداشت جواب دے گئی تو اُسکے پاس آیا۔ علی نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا، وہ شرگ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نظروں میں بہت کچھ لیے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''لے لیا تم نے اپنا انتقام؟'' سوال تھا یا خنجر؟ علی کو اپنے دل کے آر پار محسوس ہوا۔

''اب اُسے تنگ مت کرنا'' یہ کہہ کر حسین وہاں رکا نہیں تھا، بلکہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ عمر نے اُسکی طرف دیکھا بھی نہیں، مقدّم نے ملامتی نظروں سے اور نوید نے اسے افسوس سے دیکھا تھا۔ اور سب ہی باری باری باہر نکل گئے۔ وہ وہاں اکیلا رہ گیا، حسین کے ایک جملے نے اُسے جیسے بھرے بازار میں برہنہ کر دیا تھا۔ اسکے ایک جملے نے وہاں کھڑے ہر شخص کو یہ باور کروایا تھا کہ یہ سب اس نے رضا سے انتقام لینے کے لیے کیا تھا۔

''ہاں! لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ وہ ڈر گز لیتا تھا۔'' اُس نے خود کو جھوٹی تسلی دینی چاہی، دماغ نے رضا کو پھر سے مجرم دکھانا چاہا۔ لیکن دل اس بار ساتھ نہیں دے سکا۔

''علی کو ہو کیا گیا ہے آخر؟ جو اُس نے آج کیا اُسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' مقدّم کو ٹھیک ٹھاک غصّہ آیا ہوا تھا۔ وہ پارکنگ میں آچکے تھے۔

''پتہ نہیں!'' عمر اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ ذہن اُلجھا ہوا تھا کہ رضا ڈر گز لیتا رہا تھا مگر کیوں؟

''وہ بیچارہ اپنی جان خطرے میں ڈالے اُس مجرم سے ملنے گیا، ہماری خاطر۔۔۔ اور اُسے اِس طرح ذلیل کر کے رکھ دیا اُس نے۔۔۔'' مقدّم کا غصّہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ رضا اور حسین اُن سے پہلے باہر نکلے تھے، لیکن پارکنگ میں نظر نہیں آرہے تھے، نہ اُنکی گاڑیاں کہیں تھیں۔ اس مرتبہ اُن سب کی گاڑیوں کو پہلے سے ہی پارکنگ میں لا کھڑا کیا گیا تھا، اور اُنہیں اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ خود ہی چلے جائیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا علی باہر آیا اور اُن دونوں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھتا، وہاں سے چلا گیا۔

''یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے میری سمجھ سے باہر ہے۔ ہر شے میرے سر کے اوپر سے گزر رہی ہے'' عمر بے بسی سے بولا۔ خاکی پینٹ پر بلیک شرٹ پہنے نوید بھی اُس لمحے پارکنگ میں آیا اور رضا کو ڈھونڈنے لگا، غلطی اُسکی بھی تھی۔ اُس نے بھی اُس پر شک تو کیا تھا، لہٰذا اب اس سے معذرت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

''یقیناً جا چکا ہے۔''اُس نے سوچا اور تاسف سے سر ہلایا۔ مقدّم اور عمر اب تک وہیں تھے۔ اُس سے کچھ فاصلے پر کھڑے دونوں آپس میں محو گفتگو تھے۔ نوید کا فون بجنے لگا۔

''بولو شیراز!'' وہ فون کان سے لگائے آگے بڑھا۔

''کچھ مشکوک لوگوں کو آفس کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے۔''شیراز نے کہا۔

''واٹ؟ کب؟''اُسکے قدم تھمے۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی۔۔۔آپ اپنے دوستوں کو جلد از جلد وہاں سے نکالیں'' معاملہ گڑ بڑ تھا۔

''ٹھیک ہے!''اُس نے موبائل جیب میں رکھا اور تیزی سے اُن دونوں کی جانب بڑھنے لگا۔ اُن سے کچھ دور ہی ہوگا کہ فضا میں گولیوں کی تیز آواز سنائی دی تھی۔ ایک لمحے کو تو کوئی بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اگلے ہی پل نوید تیزی سے آگے بڑھا اور مقدّم کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے پیچھے دھکیلتے ہوئے چیخا۔

''نیچے بیٹھو!'' وہ ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ گاڑی کی اوٹ لیکر نیچے بیٹھے تھے۔ نوید نے بیٹھے بیٹھے کمر سے اپنی گن نکالی اور ذرا سا باہر کی طرف جھانکتے ہوئے فائر کیا اور فوراً پیچھے ہوا۔ گولیوں کی آواز اب بہت زیادہ ہونے لگی تھی۔ وہ تینوں ہی گاڑی کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' مقدّم نے پریشانی سے پوچھا۔

''کچھ مشکوک لوگ اندر گھس آئے ہیں۔ ابھی یہ نہیں معلوم کہ کون ہیں؟ اور کس مقصد سے آئے ہیں؟''نوید نے جواب دیا۔

''یہ۔۔۔ یہ خون کہاں سے آ رہا ہے؟''یکدم ہی عمر کی نظریں زمین پر بہتے خون پر پڑیں۔ اُسکی نظروں کے تعاقب میں مقدّم نے بھی دیکھا، اور اُسی لمحے اُن دونوں کی نظریں نوید کے بازو تک گئی تھی۔

''تمہیں گولی لگی ہے۔۔۔'' وہ دونوں ساتھ ہی چیخے تھے۔

''پریشان مت ہو کچھ نہیں ہوا۔'' مقدّم کو جس گولی سے اُس نے بچایا تھا وہی گولی اُسکے بازو پر لگی تھی۔

''رکو!'' عمر نے بیٹھے بیٹھے گاڑی کے پیچھے کا دروازہ کھولا۔

''عمر! کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو چکے ہو؟''نوید اُسکی اس حرکت پر چیخا تھا۔ لیکن وہ گاڑی سے ایک لمبا کپڑا نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

''یہ باندھو اسکے بازو پر۔۔۔''اُس نے کپڑا مقدّم کی جانب بڑھایا کیوں کہ اُسکے اور نوید کے درمیان وہی بیٹھا تھا۔ اُس نے کپڑا لیا اور نوید کا بازو تھاما۔

''فار گاڈ سیک! میں ٹھیک ہوں''وہ جھنجھلایا۔

''شٹ اپ۔۔۔''مقدّم نے اتنا ہی کہا اور اپنا کام جاری رکھا۔ نوید بس اُسے گھور کر رہ گیا تھا۔

''فائرنگ کی آواز آنا بند ہو گئی ہے؟''اچانک ہی عمر کو احساس ہوا۔

''شش!''نوید نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور اوپر بلڈنگ کی طرف دیکھنے لگا۔ پہلی منزل پر، ایک پلر کی اوٹ میں کوئی شخص کھڑا تھا۔

''فیصل!''نوید کے لب ہلے۔ فیصل نے محتاط انداز میں نوید کو دیکھا اور پہلے گاڑی کے پیچھے اشارہ کیا اور پھر ہاتھ کی دو انگلیاں اٹھا کر وی کا نشان بنایا جسے سمجھ کر اُس نے سر ہلایا اور اپنی جگہ سے ذرا سا کھسکا۔

''تم دونوں۔''چہرہ موڑ کر اُن کی جانب دیکھا''اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت۔''اس سے پہلے وہ دونوں کچھ سمجھتے ایک ہی جست میں نوید کھڑا ہوا، اُسکے کھڑے ہوتے ہی دوسری جانب سے فائرنگ شروع ہوئی اور وہ اُسی کے درمیان میں کھڑا، اپنے زخمی بازو سے گن پکڑے مسلسل فائر کرتا، اُن دونوں شرپسندوں کو جہنّم واصل کر چکا تھا۔ اُنہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اُس نے مڑ کر فیصل کو دیکھا اور سب کلیئر ہونے کا اشارہ کیا۔ لیکن فیصل نے اُسی لمحے اپنی گن اٹھائی اور نوید کی جانب کر کے ٹرِگر دبا دیا۔ گولی اُسکے برابر سے ہوتی اُسکے پیچھے نمودار ہوتے ایک اور شرپسند کے دماغ پر جا کر لگی تھی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہوا اور پھر بگڑ کر فیصل کو دیکھا۔ ڈرا دیا تھا اس نے تو۔۔۔

''سوری!''اُس نے وہیں سے چلا کر کہا۔

''تم دونوں اندر جاؤ جلدی۔۔۔'' اُس نے مقدّم اور عمر کو کہا تو وہ دونوں تیزی سے اندر کی طرف گئے، لیکن وہ ساتھ نہیں آیا، اندر افرا تفری مچی ہوئی تھی۔

''پریشان نہ ہو! کچھ شر پسند عناصر نے ہم پر حملہ کرنے کی جرات کی تھی، لیکن اب سب کلیئر ہے۔ دو زندہ پکڑے گئے ہیں اور تین مارے گئے ہیں۔'' شیراز نے اُن کے پاس آتے ہوئے تسلی دی۔

''نوید کو گولی لگی ہے۔'' اس ساری بات کے جواب میں عمر نے پریشانی سے بس یہی کہا تھا۔

''کوئی مسئلے کی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ پانی پئیں'' اُس نے گلاس آگے بڑھایا تو اُنہیں اچھنبا ہوا۔

''اُسے گولی لگی ہے، وہ زخمی ہے۔'' مقدّم نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کس کو گولی لگی ہے؟'' اُسی لمحے فرّخ صاحب وہاں داخل ہوئے۔

''نوید کو۔'' اُس نے مختصر جواب دیا۔

''ابھی کہاں ہے؟'' اُنہوں نے آرام سے پوچھا۔ مقدّم نے حیرت سے عمر کو دیکھا، وہ حیران تھا، بھلا ایک شخص کو گولی لگی تھی اور وہ لوگ ایسا برتاؤ کر رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''وہ بلڈنگ کا چکر لگانے گیا ہے تاکہ دیکھ سکے کہ کہیں کوئی چھپا ہوا نہ ہو۔'' جس کو گولی لگی تھی، اُسے خود بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ بتاؤ ذرا۔۔۔؟

''پریشانی کی بات نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہوا ہے اُسے۔ نوید سب کلیئر ہونے کا اشارہ کر دے تو تم لوگ جا سکتے ہو'' اُنہوں نے اُنکی پریشان صورت دیکھ کر کہا۔ اور نوید واقعی کچھ دیر میں وہاں آ چکا تھا۔ بازو پر باندھا گیا کپڑا خون آلود ہو چکا تھا۔

''سب کلیئر ہے، لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ آخر تم سب کر کیا رہے تھے؟ پانچ آدمی آفس کے احاطے میں داخل بھی ہو گئے اور ہمیں معلوم بھی نہ ہوا؟'' آتے ساتھ ہی وہ وہاں کھڑے تمام ٹیم ممبرز پر بگڑا تھا۔

''سوری۔۔۔'' ایک جونیئر آفیسر نے کہا۔

''واٹ سوری؟ تم لوگوں کی اس نااہلی کی وجہ سے آج کتنا بڑا نقصان ہو سکتا تھا؟ ہاں؟'' اُسکے ٹیم ممبرز سر جھکائے اُسکی جھاڑ سن رہے تھے۔ فرّخ صاحب ہر شے کو یکسر نظرانداز کیے اپنے سسٹم میں سر دیے بیٹھے تھے۔ شیراز اُن دونوں کے پاس آیا۔

''آپ دونوں جاسکتے ہیں۔ہمارے سکیورٹی گارڈز آپکے ساتھ جائیں گے۔''اُس نے کہاتو وہ سر ہلاتے ہوئے جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ایک نظر نوید کو دیکھا جواب ایک کرسی پر بیٹھے اپنے بازو پر بندھا کپڑا کھول رہا تھا،اُسکے پاس کچھ اور آفیسرز بھی تھے۔

اُس نے مقدّم کی جان بچائی تھی،اور اُسے اس حالت میں دیکھ کر اُن دونوں کا دل دہل گیا تھا۔

پس ثابت ہوگیا تھا،دلوں میں نفرت نہیں آئی تھی۔۔۔

دیواریں گرادی گئی تھیں۔۔۔

فاصلے اب بھی باقی تھے۔۔۔

واپسی کی منزل کے وہ مسافر۔۔۔

بہت جلد اپنی منزلوں پر پہنچنے والے تھے۔۔۔

----------+---------+--------

ڈرگ ایڈکٹیڈ۔۔۔مجرم۔۔۔نشہ

زہر میں ڈوبے،اُسکی ذات کے پرخچے اڑاتے علی کے الفاظ،اُسکے دماغ پر برس رہے تھے۔سر درد سے پھٹ رہا تھا۔اسی لیے۔۔اسی لیے وہ اُن سب کا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''آج تم نے میرے ساتھ دوسری دفعہ یہی کیا ہے۔''گاڑی چلاتے رضا نے لب بھینچے سوچا تھا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ پیچ چورا ہے پر اُسکا راز اس طرح افشا کرے گا۔قطع تعلقی اپنی جگہ لیکن ماضی میں کوئی تو تعلق تھا نہ اُنکا؟اُس تعلق،اُس دوستی کا ہی پاس رکھ لیتا وہ۔

''لیکن اُسے یہ بات معلوم کیسے ہوئی؟''یکا یک ہی اُسے خیال آیا۔لیکن اس سوال کا جواب اُسکے پاس نہیں تھا۔بلاوجہ،انجان راستوں پر گاڑی دوڑاتے بلآخر وہ تھک کر پناہ گاہ پہنچا تو مغرب کا وقت ہورہا تھا۔گاڑی سے اترا تو خلاف توقع لان خالی تھا۔بچے یقیناً جزا کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہوں گے۔آج کل وہ بچوں کو قرآنی سورتیں یاد کروا رہی تھی اور ساتھ ہی نماز پڑھنا بھی سکھا رہی تھی۔بڑے بچے ان سب میں اُسکی بہت مدد کرتے تھے۔اُس نے اکیلے اتنے بچوں کو سنبھال لیا تھا کہ کبھی کبھی رضا بھی حیران ہو جاتا۔

اُسکا خیال آیا تو دل عجیب سا ہوا۔ بھلا وہ کیسے بھول گیا تھا کہ اُسکا ایک ماضی تھا؟ دل پر بھاری بوجھ آن ٹھہرا تھا۔اندر جانے کے بجائے وہ لان میں ہی رکھی کرسی پر آ بیٹھا اور پشت پر سر گرا کر آنکھیں موند لیں۔ علی کے الفاظ، اُسکی نفرت بھری نظریں بار بار آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ چند لمحے بھی سکون سے نہ گزرے تھے کہ اُسے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ آنکھیں کھول کر یہاں وہاں دیکھا، پر کوئی نظر نہ آیا۔اس سے پہلے کہ وہ اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتا، سسکیاں دوبارہ سنائی دیں۔ وہ ایکدم ہی الرٹ ہو بیٹھا۔

''ارمینہ ؟۔۔۔ارمینہ یہ تم ہو؟'' وہ اپنے بچوں کی آہٹ بھی پہچانتا تھا۔ سسکیاں رک گئی۔اُس نے بے چینی سے اُٹھ کر لان میں تلاشنا شروع کیا اور اگلے ہی لمحے وہ اُسے کیاری اور گملے کے بیچ چھپی ہوئی نظر آئی۔

''ارمینہ۔۔'' وہ پنجوں کے بل اُسکے پاس بیٹھا۔اُس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح خوف کا سایہ اُسکے چہرے پر لہرایا تھا۔

''اِدھر آؤ گڑیا!'' اس نے ہاتھ بڑھایا پر وہ اُسکا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اُٹھ کر بھاگ گئی۔

''ارمینہ۔۔۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔اُسی لمحے جزا بھی لان میں آئی تھی لیکن وہ اُسے بھی دھکا دے کے اندر بھاگتی چلی گئی۔

''ارمینہ۔۔۔'' جزا نے بھی پیچھے سے آواز دی۔

''جانے دو اُسے جزا!'' رضا نے اُسکے پاس آتے ہوئے کہا۔

''یہ ایسی کیوں ہے؟'' اُس نے الجھ کے رضا کو دیکھا

''ایسی یعنی؟''

''یعنی ہر وقت ڈری سہمی رہتی ہے۔ بچوں سے بات بھی نہیں کرتی نہ کسی کھیل کود میں حصہ لیتی ہے''

''اُسے یہاں آئے ہوئے ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا ہے۔ سب کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ تھوڑا اسپیس دو اُسے'' رضا نے کہا۔

''ٹھیک ہے! اچھا مجھے آج ذرا جلدی جانا ہے۔'' اُس نے زیادہ کریدا نہیں تھا۔

''سب خیریت؟''

''کچھ کام ہے؟''اُس نے مختصر جواب دیا۔ رضا نے غور سے اُسے دیکھا، اُسکے چہرے پر پریشانی کے واضح آثار نظر آرہے تھے۔

''تم ٹھیک ہو؟''اُس نے پوچھا۔ اپنی پریشانی تو وہ بھول بھال گیا تھا۔

''وہ۔۔دراصل۔۔''وہ کچھ تذبذب کا شکار تھی۔

''کہو! میں سن رہا ہوں''

''میں اکثر مارکیٹ جاتی ہوں گھر کا سامان وغیرہ لینے۔ سوسائٹی کے آخر میں جو پولیس والے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ پچھلے دو دنوں سے مجھے آتے جاتے تنگ کر رہے ہیں۔''رضا کا دماغ بھک سے اُڑا تھا۔

''واٹ؟اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟ تمہیں مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا۔''جزا کے چہرے پر تعجب اُبھرا۔

''میں اُن سے ڈرتی نہیں ہوں۔ دو منٹ لگیں گے مجھے اُنہیں اُنکی اوقات میں واپس لانے میں۔۔۔''اُسکے انداز پر تو وہ حیران ہی رہ گیا۔

''میں بس یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟اُنہیں وارن کرنا چاہیے یا اُنکی کمپلین کرنی چاہیے'' اُس نے وضاحت کی۔

''جزا! میں مانتا ہوں کہ تم ان سے ڈرتی نہیں ہو گی۔ لیکن تمہیں خود سے کوئی اقدام نہیں لینا چاہیے۔ یہ معاملہ میرے اوپر چھوڑ دو اور کچھ دن تک باہر آنا جانا نہ کرو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ۔۔۔''

''ایکسکیوز می؟''اُس نے بات کاٹتے ہوئے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں ڈر کے گھر میں بیٹھ جاؤں؟ میں نے اپنے بھائیوں کو اسی لیے نہیں بتایا کہ وہ بھی مجھے یہی مشورہ دیتے۔ تمہیں اس لیے بتایا کہ تم شاید کوئی معقول حل بتاؤ، لیکن تم بھی وہی باتیں لیکر بیٹھ گئے؟''وہ ٹھیک ٹھاک تپ گئی تھی۔ غصّے سے چہرہ لان میں لگے گملوں کی طرف کر لیا، رضا جو اُسکے انداز دیکھ حیران تھا، بیساختہ مسکرایا۔

''میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ تم ڈر کر گھر بیٹھ جاؤ، لیکن احتیاط کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں۔''اُسکے آخری جملے پر جزا نے نظریں اٹھا کے اُسے دیکھا۔ اور اُسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ بھلا ایسا کب ہوا تھا کہ وہ جھکی نظریں اٹھا کے اُسے دیکھے اور وہ نارمل کھڑا رہ سکے؟

''جا رہی ہوں میں گھر''، غصّے سے چبا چبا کے بولتی وہ پاؤں پٹختی وہاں سے جانے لگی۔

''جب غصّہ اُتر جائے تب بات کرینگے ہم۔''اُس نے مسکراتے ہوئے پیچھے سے کہا لیکن اُس نے جواب نہیں دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ غصّے میں ہے، وہ ہنوز مسکراتا رہا۔ یہ لڑکی اُسکی زندگی میں کسی اینٹی اینزائٹی پل کی طرح کام کرتی تھی، وہ سب بھلا کر بس مسکرائے جا رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر چہرہ گھما کے ناراضگی سے اُسے دیکھا وہ چاہ کر بھی اپنی ہنسی روک نہ سکا۔ اُسے ہنستا دیکھ کر غصّے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

اور اُسی لمحے رضاالٰہی کی تمام تر مسکراہٹ سمٹی تھی، دروازہ کھل کے بند ہونے کے درمیان جو منظر اُس نے دیکھا تھا، اُس نے اسے حیرت کا شدید جھٹکا دیا تھا، وہ ہنسنا ہی بھول گیا۔۔۔۔ ایک بھی لمحہ مزید ضائع کیے بنا وہ تیزی سے دروازے تک آیا اور جھٹکے سے اُسے کھول دیا۔

جزا جا چکی تھی، اور وہ بلکل اُسی دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ سفید ٹراؤزر اور شرٹ پر، کمر تک آتا مردانہ شرگ پہنا ہوا تھا، جسکے کنارے پر باریک سی کالی پٹّی لگی ہوئی تھی۔ ریم لیس گلاسز سے جھانکتی مسکراتی آنکھیں اُسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ پیر سفید جاگرز میں مقید اور شرگ کی آستینیں کہنیوں تک چڑھائے وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

رضا آگے بڑھنا چاہتا تھا، مگر بڑھ نہیں سکا۔۔۔ کچھ کہنا چاہتا تھا، پر کہہ نہیں سکا۔۔۔ قدم سست پڑ گئے تھے، ہر شے ساکت ہو گئی۔ وہ نہ جانے کب سے یہاں کھڑا تھا؟ اُس کو کیوں معلوم نہ ہو سکا؟ کتنے لمحات خاموشی سے گزر گئے۔ اُسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے؟ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

اُسے دیکھتا حسین سر جھکاتے ہوئے ہلکے سے ہنسا، اُسکے گالوں پر پڑتے گڑھے واضح ہوئے۔

پھر سیدھا ہوتا آگے بڑھا۔۔۔

اُسکے پاس آیا۔۔۔

اُسکے سامنے رکا۔۔۔

اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔

اور آگے بڑھ کر اُسکے گلے لگ گیا۔

رضا ہل بھی نہ سکا۔۔۔

حسین مرتضیٰ نے فاصلہ ایک جست میں پاٹا تھا۔ وضاحتیں، شکوے، شکایتیں سب چھوڑ کر اُس نے واپسی کی منزل پر براہِ راست قدم رکھ دیا تھا۔ اور ایسا صرف وہی کر سکتا تھا۔ رضا کی آنکھوں میں نمی آن ٹھہری۔ اتنے دنوں سے دل پہ چھایا بوجھ کہیں ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اُس سے الگ ہوتا حسین، اُسکی نظروں میں دھندلا گیا۔

''گدھے ہو تم۔۔۔'' اُس نے پوچھا تھا یا بتایا تھا؟ پر رضا کچھ بھی کہہ نہ سکا۔

''اتنی تیز گاڑی کون چلاتا ہے؟ کتنی بار تمہیں فالو کرنے کے چکّر میں، راستہ بھٹک گیا میں۔۔۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ یہاں تک پہنچ گیا۔'' وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

''باہر ہی کھڑا رکھو گے؟'' ماتھے پر بل ڈالے خفگی سے پوچھا۔ اب کہ رضا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تمہیں اندر آنے کے لیے میری اجازت کی ضرورت کب سے پڑنے لگی؟'' اور حسین کا قہقہہ بیساختہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حوالہ کس بات کا دیا گیا ہے؟

''پہلے کی بات اور تھی، اب تم بدل گئے ہو'' عام سے انداز میں کہا۔ لہجے میں کوئی تلخی نہ تھی۔

''تم تو نہیں بدلے۔'' رضا نے مسکرا کر کہا۔ حسین رکا۔۔۔ ٹھہرا۔۔۔ اور ٹھہرا ہی رہ گیا۔ ہاں! وہ کب بدلا تھا؟

''آؤ! اندر آؤ'' رضا نے سامنے سے ہٹتے ہوئے اُسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

پندرہ سال پہلے کی ایک رات حسین زبردستی اُسکا مہمان بنا تھا۔ وہ آج بھی خود ہی اُسکا مہمان بن گیا تھا۔ وہ واقعی نہیں بدلا تھا، وہ مسکراتے ہوئے اندر آ گیا۔ وہ اُسے لیے سیدھا لاؤنج میں داخل ہوا۔ حسین کے قدم تھمے۔۔۔ آنکھوں میں حیرت در آئی۔ ہر سائز، ہر عمر اور ہر نسل کے بچے وہاں موجود تھے۔ یہاں سے وہاں اچھلتے کودتے، شرارتیں کرتے، بات بات پر ہنستے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، دل لبھاتے معصوم چہرے۔۔۔

''رک کیوں گئے؟''اُسے دہلیز پر ہی جما دیکھ کر رضا نے پوچھا۔ وہ اپنی حیرت چھپاتا اندر داخل ہوا۔ رضا اُسکی نظروں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اُسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود اُسکے برابر ہی بیٹھ گیا۔ بچے آرہے تھے، کوئی حسین سے ہاتھ ملا کر جا رہا تھا، کوئی رضا کے کندھوں سے لٹک کر کوئی بہت ہی راز کی بات اُسکے کانوں میں بتا کر گیا تھا، کسی نے اپنا تعارف خود ہی کروانا شروع کر دیا تھا اور کچھ تو رضا کے گود میں چڑھ بیٹھے تھے۔ حسین حیرت سے اُن سب کو دیکھ رہا تھا، وہ مسکراہٹ ضبط کیے اُسکے تاثرات سے محظوظ ہوا۔

''کتنی شادیاں کر رکھی ہیں تم نے؟''بلآخر جب اُس سے رہا نہیں گیا تو پوچھ لیا۔

''ایک بھی نہیں۔''آنکھوں میں شرارت لیے جواب دیا۔

''استغفراللہ! میں کچھ غلط نہیں سوچنا چاہتا''اپنے ازلی انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا تو رضا نے الٹا ہاتھ اُسکے کندھے پر مارا، وہ ہنس دیا۔ جب حسین ساری سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگ کر واپسی کی منزل پر آچکا تھا تو اب پرانی باتیں بیکار تھیں۔ کچھ لوگ برف کی طرح ہوتے ہیں، اپنے آس پاس موجود ہر تپش کو اپنے اندر جذب کر کے ماحول کو فرحت بخش ٹھنڈک عطا کر دیتے ہیں۔ وہ بھی اُن ہی لوگوں میں سے تھا۔

''یہ میرا وہ خواب ہے، جو میں نے کبھی دیکھا تھا''رضا نے آہستگی سے بتایا۔

''میں سمجھ گیا تھا۔''اُس نے نرمی سے جواب دیا۔ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا چائے لے آیا تھا۔ عائشہ جی کسی کام سے بچیوں کو لیکر بازار گئی ہوئی تھیں۔ اسی لیے لڑکوں کے ذمّے یہ کام تھا۔

''کام کیا کرتے ہو تم؟''اچانک ہی یاد آیا تو پوچھا۔

''ڈرگز تو بلکل نہیں بیچتا۔''اس جواب پر دونوں ہی دل کھول کر ہنسے تھے۔ بچے حیران تھے، اُنہوں نے کبھی بھی رضا کو کسی باہر کے انجان شخص کے ساتھ اتنا ہنس کر بات کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔

''نظر انداز کر دو اُسے۔''اُس نے کچھ سمجھانا چاہا۔

''میں اُسکا ذکر بھی نہیں سننا چاہتا۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا، بات علی کی تھی۔

''اوکے۔ چائے تو بہت اچھی ہے لڑکے!''حسین نے چائے بنانے والے لڑکے کی طرف دیکھ کر تعریف کی۔۔۔ صاف، بات بدلی۔

''شکریہ''لڑکا شرمیلا تھا۔

''شہباز! ذرا انکو بتاؤ تم کیا کرتے ہو؟''اپنے بچوں کو لوگوں سے ملوانا اُسے بہت پسند تھا۔

''ہمارا شہباز، انڈر سکسٹین کرکٹ ورلڈ کپ کے لیے ٹیم میں سیلیکٹ ہو چکا ہے''اُسکے بجائے دوسرے لڑکے نے جواب دیا، شہباز جھینپ گیا۔

''ارے! میں مستقبل کے سلیبرٹی کے سامنے بیٹھا ہوں یعنی۔۔۔''حسین کے کہنے پر وہ مزید شرما گیا۔

''انکا تعارف تو کروائیں۔''اب کے لڑکوں نے حسین کے بارے میں جاننا چاہا۔

''ان سے ملو، یہ میرے دوست ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں''رضا کے تعارف کروانے کے طریقے پر وہ محظوظ ہوا۔

''آپ نے کبھی بتایا نہیں کہ آپکے کوئی دوست بھی ہیں؟''

''اور وہ بھی اتنے اچھے۔''لڑکے پتہ نہیں کیوں خوش ہو رہے تھے؟

''انکی یاداشت کبھی کبھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے''حسین نے چوٹ کی۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا ایک لڑکا وہاں بھاگتا ہوا آیا۔

''بھائی! رضا بھائی!۔۔۔''اُسکا سانس پھول رہا تھا۔

''کیا ہوا؟''اُسے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

''وہ ارمینہ۔۔۔ارمینہ۔۔۔''

''کیا ہوا ارمینہ کو؟''وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اُس نے خود کو زخمی کر لیا ہے۔'' اگلے ہی لمحے رضا بھاگ کر وہاں پہنچا، جہاں ارمینہ تھی۔ حسین بھی پیچھے آیا تھا۔وہ اسٹور روم میں ایک پرانے پلنگ کے نیچے چھپی بیٹھی تھی۔یہ لوہے کا پلنگ ٹوٹ چکا تھا،اُس نے اسے سٹور روم میں رکھوا دیا تھا اور اُسکی جگہ بچوں کے کمرے میں

نیا پلنگ ڈلوا دیا تھا۔ اُسکا ارادہ تھا کہ اسے مرمت کیلیئے بھیج دے گا لیکن اب تک موقع نہیں مل سکا۔ وہ پنجوں کے بل پلنگ کے پاس بیٹھا اور نیچے جھانکا۔ وہ سمٹی، سکڑی بیٹھی تھی۔ پلنگ کے ٹوٹے لوہے سے اُسکا پیر زخمی ہو چکا تھا۔

''ارمینے!۔۔۔ باہر آؤ بیٹا'' اُس نے پچکارتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ سہم کر پیچھے ہوئی۔

''ارمینے!۔۔۔'' اُس نے اُسکا خوف کم کرنا چاہا لیکن پیچھے ہونے کے چکّر میں اُسکا پاؤں مزید زخمی ہو گیا۔ وہ سسک اٹھی۔۔۔

''ارمینہ! کیا کر رہی ہو؟ چوٹ لگ جائیگی، آؤ۔۔۔ باہر آؤ۔۔۔'' وہ مسلسل اُسے باہر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی طرف گھسیٹنا چاہا تو اب کہ وہ اتنی زور سے چیخی کہ وہ بھی بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔

''کیا کریں اب؟'' ایک لڑکے نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں اسی طرح اُسے کھینچ کر باہر نکالوں گا، عظیم! تم فرسٹ ایڈ باکس لے آؤ۔ تمہیں اسکا زخم صاف کرنا ہے۔'' اُس نے لڑکوں کو ہدایت دی۔

''وہ ڈر رہی ہے رضا!'' حسین کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''اب بھلے وہ جتنا بھی ڈرے، یہی آخری حل ہے۔'' اُس نے عجلت میں کہا۔ پھر ایک ہاتھ ارمینہ کے سر پے رکھا، جو پلنگ کے لوہے سے ٹکرا رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے اُسے باہر کھینچ لیا۔ اُس کے اس طرح کرنے پر وہ جس دلخراش انداز میں چیخی تھی، حسین سمیت سب ہی گھبرا گئے تھے۔ وہ بھی بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اُسے مارنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس مرتبہ رضا نے اسکو قابو کر لیا اور بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ چلا چلا کر رو رہی تھی، اُسے نکالنے میں وہ اپنا ہاتھ بھی زخمی کر چکا تھا۔

''اسکا زخم صاف کرو جلدی'' اس نے عظیم کو کہا۔ وہ اُسکا پاؤں پکڑے جلدی سے خون صاف کرنے لگا۔ وہ اچھا خاصا پاؤں زخمی کر چکی تھی۔ اُسکی چیخیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں، ناخن سے جا بجا رضا کے بازو پر نوچا تھا۔ لیکن وہ بھی اُسی طرح اُسے خود میں بھینچے بیٹھا رہا۔ وہ بچی تھی جتنی مزاحمت کر سکتی تھی کر چکی تھی۔ بلآخر جب تھک گئی تو بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ رضا نرمی سے اُسکا سر سہلاتا رہا۔ عظیم اُسکا زخم صاف کر کے پٹّی کر چکا تھا۔ رضا نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔ اس بار اُس نے مزاحمت نہیں کی، بس اُسکی گود میں روتی رہی۔ وہ اُسے لیے باہر آ گیا، بچے بیچارے ڈر گئے تھے۔

''جاؤتم سب آرام کرو۔ میں اسکے ساتھ ہوں پریشان نہ ہو''اُس نے بچوں سے کہاتو وہ باری باری وہاں سے چلے گئے۔ ارمینہ کا رونا اب سسکیوں میں بدل گیا تھا۔

''یہ جو کچھ بھی ہوا اُسکے لیے معذرت۔''حسین پر نظر پڑی تو شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

''معذرت کیوں کررہے ہو؟ میں تو پریشان ہوں کہ اتنی سی بچی اس قدر خوف زدہ کیوں ہے؟''حسین نے دکھ سے رضا کی گود میں منہ چھپائے روتی ارمینہ کو دیکھا۔

''اسکے ماں باپ، بہن بھائیوں کو ایک رات اسکے چچانے تیز دھار آلے سے قتل کر دیا تھا۔ اسکو بھی قتل کرنا چاہتا تھا، پر یہ ڈر کر کسی صندوق میں چھپ گئی تھی۔ البتہ اس نے اپنے گھر والوں کی اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے دیکھا ہے۔''وہ اُسکی گود میں سو چکی تھی۔

''کیوں کیا اسکے چچانے ایسا؟''

''جائیداد۔''اُس نے مختصر جواب دیا۔ پھر سوئی ہوئی ارمینہ کو صوفے پر لٹا کر، اُسے کمبل اوڑھا دیا۔

''تم نے کیسے سنبھال لیا اسے؟''اُس نے پوچھا، موبائل پر کوئی نوٹیفکیشن آیا تھا۔ اُس نے سرسری سی نگاہ ڈالی۔۔۔

''یہاں آنے والے سب ہی بچے ایسے ہوتے ہیں، ڈرے سہمے، ضدی، کچھ تو وائلنٹ بھی ہوتے ہیں۔''

''بہت بڑی ذمے داری نبھا رہے ہو تم''اُسکا فون دوبارہ بجا تھا۔ اُس نے موبائل باہر نکال ہی لیا۔ کسی نیوز چینل کا نوٹیفکیشن بار بار آرہا تھا۔ اُس نے چینل سبسکرائب کیا ہوا تھا شاید۔

''بچے صرف ایک ہی زبان سمجھتے ہیں۔ پیار اور محبت کی۔۔۔ اس شے سے دنیا کا ہر بچہ قابو ہو سکتا ہے۔''موبائل دیکھتا حسین اُسکی بات سن کر مسکرایا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اُسکی مسکراہٹ سمٹی۔ وہ چونک کے کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا؟''رضا حیران ہوا۔

''رضا!''حسین نے چہرے پر پریشانی لیے اُسے دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے اُس نے جو بتایا تھا اُسکے بعد وہ دونوں سب چھوڑ کر وہاں سے باہر نکلے تھے۔

----------+---------+--------

ہسپتال کی راہداری مصروف سی تھی، وہ دونوں تیز قدم اٹھاتے، مطلوبہ کمرے کے باہر پہنچے۔ دروازہ کھلا تھا، کمرے کے اندر پلنگ پر بیٹھا نوید، بازو پر ارم سیلنگ چڑھائے سامنے کھڑے مقدّم اور عمر کو دیکھ کم اور گھور زیادہ رہا تھا۔ دونوں ہی اُسے مکمل نظرانداز کیے ڈاکٹر کی ہدایات سننے میں مصروف تھے۔ شیراز باہر راہداری میں کھڑا کسی سے فون پر محو گفتگو تھا۔ بیزاری سے چہرہ گھماتے نوید کی نظریں دروازے سے داخل ہوتے حسین اور رضا پر پڑیں تو اُسکی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تم دونوں؟'' اُسکی آواز پر مقدّم اور عمر نے بھی دیکھا۔

''یہ ٹھیک ہے؟'' حسین نے اُسے نظرانداز کرتے ہوئے عمر کے پاس آکر پوچھا۔

''تم نے بتایا؟'' نوید نے عمر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں!'' لیکن وہ مشکوک نظروں سے اُسے گھورتا ہی رہا۔

''میرے پاس اسکا نمبر ہی نہیں ہے تو کیسے بتاؤں گا؟'' اُس نے وضاحت دی۔

''گولی کیسے لگی تمہیں؟'' رضا نے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا، اتنے سکون سے بیٹھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''ہو جاتا ہے ایسا! کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''ہاں! کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ گولی تو تم صبح شام کھاتے ہی رہتے ہو۔ عجیب آدمی ہو یار تم۔۔۔'' مقدّم اُسکی بات پر تپا تھا۔

''پچھلے دو گھنٹے سے یہی کہہ رہا ہے۔'' اب کہ اُس نے اُن دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے خفگی سے بتایا۔

''یہ کافی مضبوط اعصاب کے مالک ہیں، واقعی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' اب کے ڈاکٹر نے بھی تائید کی۔

''جی! لوہے کے بنے ہیں'' وہ مزید تپا۔

''تم دونوں کو کیسے معلوم ہوا؟'' نوید کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

''نیوز آئی تھی حسین کے پاس۔''اُس نے بتایا۔

''میں ٹھیک ہوں! تم لوگ خوامخواہ ہی پریشان ہو رہے ہو''اب کہ اُس نے ذرا تحمل سے کہا۔

''آپ لوگ باہر جائیں، مجھے ذرا ان سے کچھ بات کرنی ہے۔''ڈاکٹر اچانک ہی بولا تھا، وہ لوگ چونکے۔

''سب خیریت ہے؟''عمر پریشان سا بولا تو نوید نے ٹھنڈی آہ بھر کے سر جھکا دیا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا ان لوگوں کو سمجھانے کا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے بس کچھ بات کرنی ہے اِن سے۔''ڈاکٹر نے تسلی دی تو وہ لوگ سر ہلاتے باہر کی طرف بڑھے۔

''رضا!''ابھی دروازے پر ہی تھے کہ نوید نے آواز دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔

''تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا تو رضا رک گیا اور باقی تینوں باہر آ گئے۔

''وہ ٹھیک ہے نہ؟''باہر آ کر حسین نے مقدّم سے پوچھا۔ اندر وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔ نوید کو دیکھتا رہا پر مخاطب نہیں کیا تھا۔

''گولی بازو میں لگی تھی، ڈاکٹر نے نکال لی ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے ویسے۔''عمر نے بتایا۔

''گولی چھو کر گزری ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔ گولی گھس گئی ہے بازو میں اور کہہ رہا ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔''حسین بڑبڑایا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، کچھ نہیں ہوا ہے اُنہیں''پاس کھڑے شیراز نے کہا۔ تینوں نے ہی اُسے گھورا تھا، بار بار اس ''**کچھ نہیں ہوا اُسے**'' کی تکرار سے بیزار ہو گئے تھے۔

''اُسے گولی لگی ہے۔ تم نے ہمیں بھی وہاں سے جانے کا کہہ دیا تھا، ہم چلے بھی جاتے لیکن اُسکے بازو سے اتنا خون بہہ رہا تھا کہ رہا نہیں گیا۔''مقدّم نے کہا۔ شیراز کے کہنے کے باوجود اُنکو تسلی نہیں ہوئی تھی لہٰذا دونوں ساتھ ہی ہسپتال آ گئے تھے۔

''حالانکہ آپ دونوں کا آنا بنتا نہیں تھا۔''شیراز نے بے نیازی سے کہا۔ رضا بھی کمرے سے اُسی وقت باہر آیا تھا۔

''یہ سب ہوا کیسے؟''آتے ہی عمر سے پوچھا۔ کتنے سال بعد عمر کو مخاطب کیا تھا اُس نے؟

پوری دہائی بعد۔۔۔

''ہم پارکنگ میں تھے اور اچانک۔۔۔''اُس کی جگہ مقدم نے تفصیل سے سارا واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔

''اُسے آرام کرنا چاہیے اب۔۔۔''اس بات پر چاروں متفق تھے۔لیکن شیراز نے نظریں اٹھا کر اُنہیں دیکھا اور مسکرایا۔

''ابھی وہ ڈاکٹر سے اپنے ڈسچارج ہونے کے متعلق بات کر رہے ہونگے۔اُسکے بعد آفس جائینگے، پھر وہاں سے گھر جائینگے اور پھر صبح آفس بھی اپنے وقت پر آئینگے۔آپ لوگ حقیقتاً فضول میں پریشان ہو رہے ہیں۔''شیراز نے کہا۔

''لیکن وہ پہلے آفس کیوں جائیگا؟''عمر نے اچھنبے سے پوچھا۔

''اپنی گاڑی وہیں چھوڑی ہے نہ اُنہوں نے، اُسی میں گھر جانا ہے۔''اُس نے سکون سے اطلاع دی تو وہ بھونچکا رہ گئے۔

''وہ اس حالت میں خود ڈرائیو کریگا؟''رضا نے تصدیق چاہی تو اس نے سر ہلاتے ہوئے تصدیق کر دی۔

''یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ نوید ذہنی مریض ہے؟''حسین نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

''نہیں نہیں! ایسا نہیں کہا میں نے''شیراز ہڑبڑایا۔

''مطلب تو یہی ہے تمہاری باتوں کا''

''نوید سر! اپنی سروس کے دوران ایک بار اغوا ہو گئے تھے۔جس شخص کو ہم نے گرفتار کیا تھا اُسکے خاندان والے کافی اونچا ہاتھ رکھتے تھے۔ہم پر دباؤ ڈالنے کے لیے اُنہیں اغوا کر لیا اُن لوگوں نے۔۔۔ایک ہفتے تک اُنکی قید میں رہے وہ''شیراز نے قریب دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''پھر؟''

''پھر کیا؟ محبت جتانے کے لیے تو لیکر نہیں گئے تھے اُنہیں، تشدد کیا اُن پر بہت۔۔۔''وہ چپ ہوا۔

''تو وہاں سے واپس کیسے آیا؟''مقدّم نے پوچھا۔انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ جلدی بکو پھر کیا ہوا؟

''بھاگ گئے تھے وہ۔۔۔لیکن انہوں نے اُنکا پیچھا کیا پھر۔۔۔''

وہ ایک اندھیری رات تھی، نوید بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لیکن وہ لوگ اُسکے پیچھے تھے، جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں لیکن اُسے فلحال یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔ اندھیرے میں اُسکا سایہ بھی نہ پا کر اُن لوگوں نے اندھادھند گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ وہ ہر طرح سے خود کو بچا رہا تھا لیکن۔۔۔

اچانک اُس کا پاؤں جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹا، گولی کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دی، ایک تیز، کڑک دار، بجلی جیسی آواز، جو لمحے بھر کے لیے وقت کو منجمد کر گئی۔

اُسے پہلے تو کچھ محسوس نہ ہوا۔ جیسے جسم لمحہ بھر کے لیے سن ہو گیا ہو۔ پھر جیسے نیچے سے کوئی تیز آنچ چڑھتی ہے، ویسی ہی ایک جلن، تڑپ، اور پھر درد، ایسا درد جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھا، ہاتھ فوری ٹخنے کی طرف گیا جہاں سے خون کی لہر نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ پوری طرح گرا نہیں، نہ ہی فوراً چیخا، بلکہ ایک عجیب سی توانائی، ایک ہنگامی طاقت اُس کے بدن میں دوڑنے لگی تھی، جیسے اندر سے کوئی بیدار ہو گیا ہو، جیسے اندر ایک زہر ہو جو وقتی طور پر دوا بن گیا ہو۔ اُس کے دماغ نے ایک پرانا، مانوس الارم بجایا۔

ایڈرینالین۔۔۔

(Adrenaline)

وہ قدرتی کیمیکل جو انسان کے جسم میں اچانک خطرے یا صدمے کے وقت خارج ہوتا ہے۔ یہ وقتی طور پر درد کو کم کرتا ہے، دل کی دھڑکن تیز کرتا ہے اور جسم کو لڑنے یا بھاگنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ اُسی کے زیرِ اثر وہ تکلیف کے باوجود خود کو سنبھالے کھڑا رہا، حالانکہ اُسکا جسم لہو سے بھیگنے لگا تھا۔ سانسیں بھاری ہوئیں، دل کی دھڑکن کانوں میں دھڑکنے لگی، اور سارا جسم جنگی مشین میں بدل گیا۔ زخمی ٹخنے کے ساتھ بھی وہ بھاگتا رہا اور اگلے ہی لمحے قریب نظر آتی کھائی میں خود کو گرا لیا۔

دشمنوں کی چیخیں، تعاقب کی آوازیں، سب پس منظر میں دب گئیں۔ اسے صرف ایک چیز نظر آ رہی تھی۔۔۔ آزادی۔۔۔ خون کا ہر قطرہ، ہر نبض اور ہر دھڑکن اُسے بھاگنے پر اکسا رہی تھی۔

چند منٹوں میں وہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ دشمن اُسے ڈھونڈتے رہے لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔

''جب وہ ہمیں ملے، تو اُنکے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر تشدد نہ کیا گیا ہو۔ وہ اٹھارہ گھنٹے اُسی حالت میں کھائی میں پڑے رہا، ٹخنے پر گولی لگنے کے باوجود بھی وہ بھاگتے رہا تھے۔ اُنکے ہاتھوں کے ناخن اُن لوگوں نے اُکھاڑ دیے تھے، جسم پر جا بجا راڈ سے مارے جانے کے نشان تھے۔ اُنکے سر پر بھی اسی راڈ سے وار کیا گیا تھا۔ اُنکی آنکھوں کے پاس جو نشان ہے وہ اُسی تشدد کا ہے۔'' وہ دم سادھے کھڑے تھے۔

''آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ ٹخنوں پر چوٹ لگنا کیسا ہوتا ہے؟ اُسے تو گولی لگی تھی، ٹخنے پر لگنے والی گولی گوشت میں گھس گئی تھی۔ صد شکر کے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اُنہیں آٹھ سے دس ماہ لگ جائیں گے دوبارہ ٹھیک سے چلنے میں۔۔۔ لیکن ایس ایس پی صاحب نے دو ماہ بعد ہی دوڑ لگا کر سب کو حیران کر دیا۔'' آخری جملہ اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''شروعات میں وہ سٹک کے سہارے آفس آتے تھے، حالانکہ فرّخ صاحب منع بھی کرتے تھے۔ جس نے اس تکلیف میں بھی گھر بیٹھنا گوارہ نہیں کیا، وہ اس ذرا سی چوٹ پر کیوں پریشان ہو گا؟'' ہاں! بلکل۔۔۔ جس نے اتنی اذیت ناک تکالیف سہی ہوں، اُسکا بھلا ایک گولی کیا ہی بگاڑ سکتی ہے؟

''اب آپ سب دیکھیے گا، تھوڑی دیر میں وہ ڈسچارج بھی ہونگے، پھر گاڑی ڈرائیو کر کے گھر بھی جائیں گے۔ میری مانیے! تو آپ لوگ بھی گھر جائیں۔ اُن کو ابھی ڈاکٹر کو راضی کرنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تو لگے گا۔'' اُس نے کہا تو عمر نے ایک نظر نوید کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا تھا۔

''فکر نہ کریں، میں آپکو اُنکا نمبر دے دوں گا۔ رات تک خود ہی میسیج کر کے پوچھ لیجیے گا۔'' اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے شیراز نے اُسے تسلی دی تو اس نے سر ہلا دیا۔

نوید نے اتنی اذیت کیسے سہہ لی تھی؟ دل میں سوچا، پھر نگاہیں موڑ کر رضا کو دیکھا، پچھلے تین ہفتوں میں ہونے والی تمام ملاقاتوں میں آج پہلی بار رضا اُنکے ساتھ کھڑا بات کر رہا تھا۔ وہ زیادہ نہیں بول رہا تھا، پر بات کر رہا تھا یہی بہت تھا۔ نہ جانے نوید نے اُسے کیوں روکا تھا؟ اور روک کر کیا کہا ہو گا؟

وہ چاروں راہداری میں تھے، اور نوید کمرے میں۔۔۔

وہ ساتھ تھے، اور ماحول کا تناؤ اب کہیں بھی موجود نہ تھا۔۔

صرف ایک شخص کی غیر موجودگی میں وہ لوگ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر برتاؤ کر رہے تھے۔۔

صرف ایک شخص۔۔۔ علی سفیر۔۔۔

----------+---------+--------

دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اُسکی چیخ ہی نکل گئی۔

''چلا کیوں رہی ہو؟اُس نے اچھنبے سے اُسے دیکھتے ہوئے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''یا اللہ مقدّم!'' وہ منہ پر ہاتھ رکھے آنکھیں بڑی کیے اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہو گیا سب خیریت ہے؟''اب کہ وہ بھی گھبرا گیا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟تمہاری شرٹ پر اتنا سارا خون لگا ہے۔اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ سب خیریت ہے؟''مقدّم نے حیرت سے اپنی آستین کو دیکھا۔ جسے وہ اتنا سارا خون کہہ رہی تھی، وہ فقط تھوڑے سے چھینٹے ہی تھے۔اُسکی غلطی کہ وہ کوٹ پہننا بھول گیا۔

''تم ٹھیک ہو نہ؟مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟''وہ ٹھیک ٹھاک پریشان تھی۔

''پانی مل سکتا ہے؟''اُس نے پوچھا۔اُسکے سوالات سے بچنے کا یہی طریقہ تھا۔

''اوہ۔۔۔ سوری۔۔۔ تم اندر آؤ'' سائیڈ پر ہوتے ہوئے اُسے جگہ دی۔وہ بھی گلی میں کھڑا کر کے اُس سے تفتیش کر رہی تھی۔وہ اندر آ گیا۔ اُس کی نانی سامنے ہی بیٹھی تھیں، مکرم اُنکی گود میں تھا۔

''السلام علیکم!''اُس نے اُنہیں سلام کیا اور فوراً اُنکے سامنے بیٹھ گیا۔اب مقدّس کے سوالات کا کون جواب دے؟

''وعلیکم السلام! کیسے ہو بیٹا؟'' وہ تو اسے دیکھ کر نہال ہو گئی تھیں۔ کافی دیر اُس سے اُسکی مصروفیات کے متعلق گفتگو کرتی رہیں۔وہ بھی پوری دلجمعی کے ساتھ اُن سے محو گفتگو رہا، جبکہ مقدس پہلو پر پہلو بدلتی رہی۔

''بیٹا کھانا کھا کر جاؤ'' باتوں کے دوران انہیں یاد آیا۔

''نہیں نانی! بس مکرم کو لیکراب گھر جاؤں گا'' وہ تھک چکا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے، میں نے کھیر بنائی تھی کم از کم وہ تو ساتھ لیتے جاؤ۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔

''کیوں زحمت کر رہی ہیں؟'' وہ شرمندہ ہوا۔

''کوئی زحمت نہیں ہوتی مجھے۔'' وہ اُسے ڈپٹتی ہوئی چلیں گئی۔ اُس نے نظریں موڑ کر مقدّس کو دیکھا تو وہ مشکوک نظروں سے اُسے ہی گھور رہی تھی۔

''بہت تیز نظریں ہیں تمہاری، دیکھو نانی نے تو دھیان بھی نہیں دیا''

''سچ سچ بتاؤ! کس کو ٹھونک کر آرہے ہو؟'' اُس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھونک کر؟'' وہ حیران ہوا۔

''یعنی کس سے مار پیٹ کر کے آرہے ہو؟''

''میں کیوں کسی سے مار پیٹ کروں گا؟''

''تو یہ خون کیسا ہے؟'' اُسکے دھونس بھرے انداز پر وہ پل پل حیران ہو ہی رہا تھا، پر مزید حیرت اپنے آپ پر تھی کہ وہ خود اُسکو کچھ کہہ کیوں نہ رہا تھا؟

''تم سے کس نے کہا یہ خون ہے؟''

''تو پھر کیا ہے؟''

''ریڈ انک (لال روشنائی)۔۔۔ آفس میں ضرورت پڑتی ہے کبھی کبھار''

''سفید جھوٹ۔۔۔'' وہ ماننے کو تیار نہ ہوئی۔

''ارے بھئی! کسی انسان کا خون نہیں ہے''

’’دیکھا دیکھا! کیسے بیان بدلا تم نے۔۔۔‘‘

’’میں نے کب بیان بدلا؟‘‘ وہ انجان بنا۔

’’مان لیا نہ آخر کہ خون ہی ہے۔‘‘

’’انسان کا نہیں ہے‘‘ اپنی بات پر زور دیتے دل ہی دل میں خود کو کوسا۔

’’ہے تو خون نہ‘‘

’’ایک بلی کا بچہ گاڑی کے آگے آگیا تھا۔ اسے ابتدائی طبّی امداد دی تھی، بس! اسی کا خون لگ گیا۔‘‘ نوید کو ’’بلی کا بچہ‘‘ کہنے پر خود پر افسوس ہوا۔

’’کہاں ہے بلی کا بچہ اب؟‘‘

’’ہسپتال میں۔‘‘ اب تک تو بلی کا بچہ ہسپتال سے فارغ بھی ہو گیا ہو گا۔ دل میں سوچا۔۔۔

’’تمہیں دیر اسی لیے ہوئی ہے آج؟‘‘

’’کوٹہ ختم آج کا‘‘ اُس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اچانک ہی کہا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ اُس نے ناسمجھی سے دیکھا۔

’’تمہارے سوالات کا کوٹہ پورا ہوا اب تم اگلی ملاقات میں دس سوال پوچھ سکتی ہو۔‘‘ کہہ کر سکون سے صوفے سے ٹیک لگالی۔ وہ جو کہ کوٹہ والی بات کو مذاق سمجھ رہی تھی، اُسے گھورنے لگی۔

’’تم سیریس (سنجیدہ) ہو؟‘‘ اُس نے کندھے اچکا لیے۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ کوٹہ ختم۔۔۔ بات ختم۔۔۔

’’یہ کیا بچوں والی حرکت ہے؟‘‘ وہ جھنجھلائی۔ مگر وہ بھی ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔

کچھ ہی دیر بعد نانی کھیر پیک کر کے لے آئیں تو وہ مکرم کو لیکر اُنہیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

''بد تمیز۔۔۔''ناک چڑھا کے اُسے خطاب دیا اور دھاڑ سے دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

----------+---------+--------

شیراز کے کہے کے مطابق وہ واقعی اگلے ایک گھنٹے میں ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر آفس آ چکا تھا۔اسکی گاڑی وہیں تھی اسی لیے گھر بھی وہیں سے جانا تھا۔وہ شیراز کے ساتھ پہنچا تو وہاں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''آپ ٹھیک ہیں؟''اُسے دیکھ کر فیصل قریب آیا۔

''ہاں!۔۔۔''وہ پاس رکھی کرسی پر بیٹھا۔

''کچھ ہوا ہے کیا؟''اُس نے اُسکی پریشان شکل دیکھتے ہوئے پوچھا تو فیصل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا ہوا ہے؟''

''خلیل۔۔۔ خلیل اپنے گھر میں مردہ پایا گیا ہے۔''اُس نے نوید کے سر پر بم پھوڑا تھا۔ وہ سناٹے میں رہ گیا تھا۔

----------+---------+--------

رات سے اعصاب بھاری تھے، صبح اٹھتے اٹھتے بھی دیر ہو گئی تھی۔ناشتہ کرنے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا،بنا ناشتہ کیے ہی آفس چلا آیا۔ حیرت کا شدید جھٹکا اُسے تب لگا،جب عمر بھی اس کے ساتھ ہی آفس میں داخل ہوا۔

''آج میں بھی لیٹ ہو گیا۔''سمجھ نہیں آیا کہ بات کیسے شروع کرے؟

''ہوں۔۔۔''عمر نے بس اتنا ہی کہا۔اُنکا جنرل مینیجر اندر آ گیا تو دونوں کی توجہ اس پر چلی گئی۔

''ہمارا آج کا وزٹ کینسل ہو گیا ہے۔ہوٹل پارک ویو والوں کے یہاں آج کوئی تقریب ہے جسکی وجہ سے انہوں نے معذرت کی ہے اور وزٹ آگے بڑھانے کو کہا ہے۔''

''اُنہیں،اگلے ہفتے کی کوئی تاریخ دے دو۔''علی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ چلا گیا۔

''اُنکی ڈیمانڈز کیا ہیں ویسے؟'' عمر نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

''ہمارا پورٹ فولیو دیا تھا، اُنہیں وہی انٹیریر پسند آیا ہے، جو آخری بار ہم نے ہائی اسکائی ہوٹلز کا کیا تھا۔ تھوڑا مختلف ہو مگر تھیم ویسی ہی مانگی ہے۔ اب جا کر ہی دیکھنا ہوگا کہ اُنکی کنسٹرکشن کیسی ہے۔ پھر اُسی حساب سے بتا سکتے ہیں'' اُس نے تفصیلاً جواب دیا تو عمر نے سر ہلا دیا۔ پھر دونوں ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو گئے۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی، پھر عمر نے نِگاہیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ گہری خاموشی میں اپنے ٹیبلٹ پر پین کی مدد سے ایک خاکہ مکمل کر رہا تھا۔ اس کی اسکرین پر پیرامیٹرک بینچ پروٹوٹائپ

(Parametric bench prototype)

کے آرگینک کروز (organic curves) ابھر رہے تھے۔

''تم fluid جیومیٹری پر کام کر رہے ہو؟'' عمر نے کافی کا سپ لیتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''یہ صرف جیومیٹری نہیں، یہ موومنٹ ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ بینچ جگہ نہ لے، بلکہ جگہ کو ڈیفائن کرے۔'' اُس نے نظریں اسکرین سے ہٹائے بغیر جواب دیا۔

''تو پھر تم نے جوئنری میں کیا سوچا؟ spline interlock رکھ رہے ہو یا hidden dowels؟'' اُس نے جاننا چاہا۔

''Hidden dowels۔۔۔ وزیبل جوائنٹ تھوڑا واضح ہو جاتے ہیں۔ اس دفعہ مجھے خاموشی چاہیے، جس طرح curved ashwood خود بولتی ہے۔'' اُس نے تفصیلاً بتایا۔ وہ واقعے اپنے کام میں بہت ماہر تھا۔ خاموشی ایک بار دوبارہ چھا گئی۔ عمر پرسوچ نظروں سے سکرین پر اُبھرتی آرگینک کروز اور مہارت سے حرکت کرتی، اُسکی انگلیوں کو دیکھتا رہا۔

''ہم کل رات کافی دیر ہسپتال میں رہے، صبح اٹھنے میں دیر ہو گئی تھی۔ اسی لیے دیر ہو گئی آج۔'' اُسکے یکدم کہنے پر علی نے سر اٹھا کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

''کون ہسپتال میں تھا؟'' وہ سمجھ نہیں سکا۔

''نوید۔۔اُسے گولی لگی تھی۔''اُس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟۔۔۔''اُس نے حیرت کی زیادتی سے گنگ ہوتے اُسے دیکھا۔

''کب؟اور کیسے؟''وہ پریشان ہوا۔

''جب تم سب چلے گئے،تو میں اور مقدّم پارکنگ میں کھڑے تھے۔تب ہی وہاں اچانک سے۔۔۔''وہ مختصراً سب بتاتا چلا گیا۔

''تم مجھے اب بتارہے ہو؟''وہ سخت ناراضی سے بولا تھا۔

''تو کب بتانا چاہیے تھا مجھے؟''سینے پر ہاتھ باندھتے اُس نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم مجھے کل رات بھی بتا سکتے تھے''

''میں نے مناسب نہیں سمجھا۔''سکون سے جواب دیتے اُس نے واپس کرسی گھمائی اور اپنے کام میں سر جھکا دیا،اِس جواب پر تو وہ تلملا کر رہ گیا۔

''کیا تم وضاحت کروگے کہ تم نے کیوں مناسب نہیں سمجھا؟''اسکو برا لگا تھا۔

''رضا بھی تھا وہاں۔۔۔میں نہیں چاہتا تھا کہ جو تم نے اُسکے ساتھ کیا ہے،اُسکے بعد تم دوبارہ اُس کا سامنا کرو۔''اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''اور یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟''اُسکے کاٹ دار لہجے پر اُس نے لب بھینچے اور ایک بار پھر کرسی اُسکی طرف گھمائی۔معاملہ بگڑ سکتا تھا لیکن آج وہ رکنا نہیں چاہتا تھا،بھاڑ میں گیا اُن دونوں کا ایک دوسرے کی ذاتیات میں مخل نہ ہونے والا معاہدہ۔۔۔جہنّم میں گئی یہ لاتعلقی۔۔۔

''میں تمہارا اور اُسکا پرانا دوست ہوں۔وہ پرانا دوست جسے تم اپنی ضد اور ہڈ دھرمی کی وجہ سے چھوڑ چکے ہو۔''اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا،علی بھونچکا رہ گیا۔اس جواب کی توقع نہیں تھی اُسے۔۔ہرگز نہیں تھی۔

''اور تم ایک بار پھر وہی غلطی کر رہے ہو۔تم نے کل پھر وہی کیا ہے علی!جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''میں نے جو کیا وہ غلط فہمی تھی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ یہی۔۔۔''سلگ کر کوئی وضاحت دینی چاہی۔

''وہ یہ نہیں کرتا۔۔۔ ہر گز نہیں کرتا۔''اُسکی بات کاٹا وہ بلند آواز میں بولا تھا۔ علی شاکٹ رہ گیا۔

''تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ پہلے نوید سے رابطہ کرتا، یا فرّخ صاحب سے۔۔۔ لیکن تم اپنی طرف سے اُسکی کوئی غلطی ڈھونڈھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے تم نے اُسکی جاسوسی کی، اُسکے بعد بھرے مجمعے میں صرف شک کی بنا پر اُسکی کردار کشی کی۔ تم نے بہت غلط کیا۔۔۔ بہت غلط''

''اور آج تم بھی وہی کر رہے ہو جو تم نے دس سال پہلے میرے ساتھ کیا تھا۔ تم میں سے کسی نے اس دن بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔''وہ ٹیبلٹ میز پر پٹختا کھڑا ہوا تھا۔ بات کل کی تھی لیکن حوالہ دس سال پہلے کا دیا گیا تھا۔

''تم کیوں چاہتے ہو کہ ساری دنیا تمہیں سمجھے؟ تم نے کبھی کسی کو سمجھنے کی، کسی کی جگہ پر آ کر اُسکے حالات جاننے کی کوشش کی ہے؟ تمہاری دنیا صرف تمہارے گرد ہی کیوں گھومتی ہے؟''اُنکی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ سیکریٹری بھاگتا ہوا وہاں آیا تھا۔

''سر! کیا ہوا ہے؟''اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

''باہر جاؤ!''اُسے انگلی سے باہر جانے کا اشارہ اس سختی سے کیا گیا تھا کہ وہ بنا کوئی مزید سوال کیے واپس پلٹا۔

''دروازہ بند کر کے جاؤ!''عمر نے کہا تو اس نے دروازہ بند کر دیا پھر وہ کھڑا ہوا۔

''میں نے کبھی کوئی کام اپنی ذات کے لیے نہیں کیا، کل جو ہوا اُسکے پیچھے میری نیت تم سب کو کسی بڑے نقصان سے بچانا تھی۔ ٹھیک ہے وہ غلط فہمی تھی، لیکن مجھے یہ غلط فہمی کیوں ہوئی؟ یہ جاننے کی کوشش کی ہے؟''علی کا لہجہ سخت مگر بے بس سا تھا۔ وہ ساری زندگی کسی کو بھی اپنی بات سمجھا نہیں سکا تھا۔ نہ اپنے باپ کو، نہ دوستوں کو، نہ بیوی کو اور نہ ہی اولاد کو۔

''کیوں کہ تم نے یہ جان لیا تھا کہ وہ ماضی میں ڈر گز لیتا تھا، تو تم نے اُسے ہی مجرم مان لیا؟ لیکن نہیں۔۔۔ یہ جاننے سے پہلے بھی تم اُسے مجرم مان چکے تھے۔ تمہارا ذہن اُسے ایک مجرم، قبول کر چکا تھا۔ تم بس ثبوت چاہتے تھے۔ تم نے اتنے لوگوں کے سامنے اُسکی عزت نفس پر حملہ کیا۔ کیا تم دوست ہونے کے ناطے ہی اُسکا پردہ نہیں رکھ سکتے تھے؟''دو ماہ پہلے جب وہ مقدّم سے اتفاقیہ ملے تھے، تب تقدیر نے

لکھ دیا تھا کہ اُنکے درمیان حائل یہ دیوار بہت جلد گرے گی۔ موضوع نکلے گا، پرانی باتیں ہونگی، وضاحتیں ہونگی، شکوے ہوں گے، غلط فہمیاں ہونگی۔۔۔ لیکن وہ زیادہ دیر اس موضوع سے نظریں نہیں چرا سکیں گے۔

اور آج وہ کھڑے تھے۔۔۔ ایک دوسرے کے سامنے۔۔۔ بات رضا سے شروع ہوئی تھی اور دس سال پیچھے پہنچ چکی تھی۔

''تم نے نوید کی دوستی کا بھرم بھی نہیں رکھا تھا، دس سال پہلے تم نے اُسکے ساتھ بھی یہی کیا تھا؟'' علی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ دس سال پہلے کے اس واقعے میں وہ تو وہاں موجود نہیں تھا، پھر اُسے، اُسکی اور نوید کے درمیان ہوئی گفتگو کا علم کیسے ہوا؟

''تم اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟'' بولتے بولتے اُسکا گلا رندھ گیا تھا۔

''عمر! جذباتیت سے کام لینا چھوڑ دیا ہے میں نے۔۔۔ دوستی، انسانیت، رشتے۔۔۔ یہ سب بے معنی ہو چکے ہیں میرے لیے، میرے نزدیک اُس وقت، رضا میرا دوست نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسکا ماضی قابلِ اعتراض تھا۔ مجھے فرق نہیں پڑتا اُسکے ماضی سے، لیکن اُسکے ایڈکٹیڈ (عادی نشئی) ہونے کی وجہ سے ہی تو وہ خلیل کو جانتا تھا۔ یہ بات اہم تھی۔ میں نے پریکٹیکل بن کے سوچا تھا اُس لمحے، جذبات واحساسات سے نہیں۔۔۔ اور پریکٹیکل بن کر ہی سوچتا ہوں میں اب، مجھے تم لوگوں نے ہی تو یہ سکھایا ہے۔'' سنجیدگی سے کہتے اُسکے ہر ہر لفظ کے پیچھے ایک داستان رقم تھی۔ عمر گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ یہ مسئلہ ایسے حل نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی آسانی سے تو بلکل نہیں۔۔۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا، کرسی کھینچ کر قریب کی اور اُسے اشارہ کیا۔

''بیٹھو!'' علی نے چند لمحے اُسے دیکھا اور پھر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ عمر نے میز کے پاس جا کر گلاس میں پانی نکالا، پھر اُسکے پاس آیا۔ پانی کا گلاس اُسکی جانب بڑھایا جو کہ اُس نے خلافِ توقع خاموشی سے تھام لیا۔

عمر اُسے دیکھ رہا تھا، اور وہ چپ سا، سر جھکائے پانی کے گلاس کو۔ مسئلہ اُسکے ساتھ بھی تھا، پریشان وہ بھی نظر آتا تھا۔ عمر اندھا نہیں تھا، اس شخص کے ساتھ اُس نے چھ سال گزارے تھے، وہ اُسکا چہرہ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ زندگی نے کچھ اچھا اُسکے ساتھ بھی نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ اس طرح اُسے ساری دنیا سے بدلا لینے کے لیے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ اُسے غلط فیصلے کرنے، غلط راہ پر چلنے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اُسکا دوست تھا۔۔۔ ہاں! دوست۔۔۔ اور دوستی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اُسکے غلط کو غلط کہے۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اُسکے سامنے آ بیٹھا۔

''دس سال پہلے ہم کم عمر تھے علی !۔۔۔ نا سمجھ تھے، حالات کو سنبھالنا نہیں جانتے تھے۔''اُس نے بولنا شروع کیا۔اب کہ اُسکی آواز آہستہ تھی۔ علی نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ڈھیروں شکوے تھے اُسکی نگاہوں میں۔۔۔

''جو ہوا میں اُسکی وضاحت نہیں دے رہا،اُسکی کوئی وضاحت ہو بھی نہیں سکتی۔اور اگر کوئی وضاحت ہے بھی تو اب دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم سب نے تمہیں اکیلے چھوڑا تھا،اور اسکی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ایک دہائی گزر گئی اور ہم نے ایک دوسرے کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے ؟''اُس نے پوچھا،وہ خاموش رہا۔

''ہم نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا۔۔۔ غلط کیا۔ لیکن اُسکا بدلہ اسطرح مت لو۔ ہم امیچور تھے، تم تو نہیں ہو۔اب انتقام لینے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''اس بات پر علی تلخی سے مسکرایا۔

''انتقام ؟بدلہ تمہیں لگتا ہے میں نے بدلہ لینے کے لیے کیا ایسا؟''وہ حد سے زیادہ بد ظن تھا۔

''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں پرانی باتوں کو بھول کر تحمل سے کام لینا چاہیے تھا''اُس نے وضاحت دی۔ اُس نے خاموشی سے رخ پھیرا۔

''علی ! کوئی بھی انسان نشے کا استعمال ایسے ہی نہیں کر لیتا، خصوصاً رضا جیسا انسان۔۔۔ تم سوچو تکلیف کی وہ کونسی انتہا ہو گی جس میں اُس نے اِس قبیح شے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب کے حصے کی کوئی نہ کوئی کہانی ہے علی ! تمہیں کسی کے بھی ماضی کو ادھیڑنے کا کوئی حق نہیں ہے''نرمی سے کہتے اُس نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔اُس نے گلاس منہ سے لگایا اور سارا پانی ایک ہی سانس میں ختم کیا۔ دونوں ہی کافی دیر خاموش رہیں۔

''جو ہوا، وہ اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اسکے پیچھے میری کوئی انتقامی کارروائی نہیں تھی۔ میں تم سب کو بھلا چکا ہوں۔ میں کوئی پرانی بات یاد بھی نہیں رکھنا چاہتا۔ تو کسی پرانی بات کا بدلہ کیوں لوں گا؟''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ واقعی بہت پریکٹیکل ہو چکا تھا۔جب ڈیڑھ دو ماہ پہلے وہ مقدّم سے ملے تھے، تب بھی اس نے حقیقت پسند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے پیشہ ورانہ طریقے سے اُس سے بات کی تھی۔ اُسکے برعکس عمر کو اپنے احساسات چھپانے میں کھلی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''کیا تم نے اُسکا دل نہیں دکھایا؟ اُسکی عزت نفس پر حملہ نہیں کیا؟ بے شک بھلا دو ہمیں، مت مانو اپنا دوست، لیکن کم از کم انسان ہونے کے ناطے ہی تمہیں اس بات کا احساس کرنا چاہیے۔'' کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا اُس نے کہ میں تم سب کو بھلا چکا ہوں۔ کتنی آسانی سے؟ عمر کا دل دکھا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں معذرت کر لوں گا اُس سے۔۔۔ ختم کرو اس بات کو۔'' اُس نے بیزاری سے کہا۔ وہ بہت بدگمان تھا۔

''تمہیں معذرت کرنے کو کس نے کہا؟ بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ ہو سکے تو اپنا دل صاف کر لو۔ ورنہ تم بھی سکون میں نہیں رہو گے۔'' وہ ایک دہائی بعد اس بات کو تسلیم کر رہا تھا کہ وہ اُسے اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ لیکن اب اسکا کوئی فائدہ تھا بھلا؟

''سوچنا اس بارے میں۔۔۔'' اُسے مستقل خاموش دیکھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور کھڑا ہو گیا، اپنا سامان اٹھایا، ایک نظر اُسے دیکھا، اور آفس سے نکل گیا۔

علی خاموش بیٹھا رہا تھا۔۔۔

وہ کیا کر رہا تھا؟ کیوں کر رہا تھا؟ جو کر رہا تھا، کیا صحیح کر رہا تھا؟

عمر نے اُسکے دماغ کی کوئی کھڑکی کھول دی تھی۔ ہر شے اب پہلے سے واضع نظر آ رہی تھی۔ دھند میں لپٹا اُسکا دماغ اب کچھ کچھ صاف ہونے لگا تھا۔

اُس نے رضا کو پانچ لوگوں کے سامنے نشئی کہا تھا۔ اُسکا ماضی جو نہ جانے اُس نے کتنی مشکل سے چھپا کر رکھا ہو گا، وہ بیچ چوراہے پر موضوع گفتگو بنایا تھا۔ لیکن رضا نے کیا کیا؟ اُس نے پلٹ کے اُسے کچھ نہیں کہا۔۔۔ نہ کوئی وضاحت دی، نہ اُسے برا بھلا کہا، نہ کوئی پرانی بات نکالی۔

علی کون ہوتا تھا اُسکے لیے میدان حشر لگانے والا؟

اُس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ دل و دماغ اب اسکو، اُسی کا سب سے بدصورت چہرہ دکھانے لگے تھے۔

اُس نے تھک کر سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

----------+---------+--------

''کل رات اتنی دیر سے کیوں آئے تم؟'' وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا جب وہ اُسکے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ نظریں اٹھا کر، کمر پر ہاتھ رکھے مشکوک نظروں سے گھورتی اپنی زوجہ محترمہ کو دیکھا۔

''تمہیں نہیں بتا سکتا'' حسین نے واپس چہرہ ٹی وی کی طرف کیا۔

''کیوں نہیں بتا سکتے؟'' وہ مزید مشکوک ہوئی۔

''تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتا'' مصنوعی دکھ سے کہا۔

''شرافت سے بتا دو ورنہ۔۔'' دھمکی دیتی حورعین اُسکے برابر بیٹھی۔

''ورنہ کیا؟''

''تایا ابّا کو بتادوں گی تمہاری مشکوک سرگرمیاں۔'' اُس نے کہا تو حسین تیزی سے سیدھا ہوا۔

''ایسا مت کرنا حور! دیکھو میرے پیر کانپ رہے ہیں۔ ڈر گیا میں تو۔۔۔'' خوفزدہ انداز میں کہا اور پھر ہنستے ہوئے سر صوفے کی پشت سے لگا دیا۔ حورعین سنجیدگی سے اُسے دیکھتی رہی۔

''کیا ہے؟'' وہ اُسکی گھورتی نظروں سے بیزار ہوا۔

''تم مجھے بتاؤ گے نہیں تو میں بھی یہاں سے نہیں ہلوں گی'' وہ ضدی لہجے میں بولی تو وہ ہار مانتا ہوا سیدھا ہو بیٹھا۔ کافی دیر سنجیدگی سے میز پر نظریں ٹکائے خاموش رہا، جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اُسے بتائے یا نہیں؟

''کیا ہوا ہے حسین؟'' وہ پریشان ہوئی۔ اتنا سنجیدہ تو وہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔

''ایک بات ہے جو میں نے تمہیں نہیں بتائی۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ بتا دینی چاہیے'' اُس نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ مزید پریشان ہوئی۔

''میں نے۔۔۔میں نے دوسری شادی کررکھی ہے۔بس اسی کے پاس تھارات کو''، جتنی سنجیدگی سے اُس نے کہا تھا اتنی ہی تیزی سے حورعین نے کشن کھینچ کر اُسے مارا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔میری تمہارے علاوہ بھی ایک بیوی ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے پیچھے ہوا۔

''سچ بتادو کہاں تھے؟'' وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

''اتنا بھروسہ مت کرو مجھ پر۔۔۔''

''بھروسہ تم پر نہیں دنیا کی باقی عورتوں پر ہے۔کم از کم ہر عورت میری جتنی اندھی نہیں ہوسکتی۔''

''چلو تم نے مانا تو کہ تم اندھی ہو۔''

''اب تم سے تایاابّا ہی حساب لیں گے۔'' وہ دھمکاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔جانتی تھی کہ وہ نہیں بتائے گا کبھی۔۔۔

''رضا ملا تھا کل،اُسی کے ساتھ تھا۔'' حور کے قدم تھمے۔تیزی سے پلٹ کر واپس آئی۔

''رضا الٰہی؟'' اُس نے تصدیق کرنی چاہی،تو حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہیں کہاں ملا وہ؟اور کیسے؟'' وہ پرجوش ہوئی تھی۔

''آں۔۔۔مجھے نیند آرہی ہے۔تم جاؤ،میں اور میری بیٹی اب سوئیں گے'' اُس نے اپنی ڈیڑھ سالہ بیٹی کو سینے پر لٹاتے ہوئے جمائی لی۔

''حسین کیوں تنگ کررہے ہو؟بتاؤ نہ۔۔'' اُسے غصّہ آنے لگا۔

''اگر ایک آدھ رس ملائی مل جاتی تو میری نیند بھاگ سکتی تھی۔لیکن کیا کروں؟ابھی تو نیند آرہی ہے بہت۔۔'' معصومیت سے کہتا حور کو وہ زہر لگا۔ پیر پٹختی وہاں سے جانے لگی،اب پوری بات جانے بنا رہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔

''میری پیاری حور!'' حسین کی آواز پر مڑ کر دیکھا تو وہ اپنی بیٹی کو سینے میں بھینچے کہہ رہا تھا۔

اُسکی اور حورعین کی بیٹی حوریہ۔۔

جیسکا نام حسین نے حور یہ رکھا تھا اور پیار سے اُسے حور کہتا تھا۔

بد تمیز! حور کا نام لیکر تعریف کرتا اور پوچھنے پر ہمیشہ کہتا کہ میں تو اپنی بیٹی کی تعریف کر رہا ہوں، تم کیوں خوش ہو رہی ہو؟

مجال ہے جو وہ کبھی اُسے خوش ہونے دے؟

----------+---------+--------

آفس جانے سے پہلے مکرم کو چھوڑنے کیلیئے جب وہ مقدّس کے گھر آیا تو دروازہ اُسکی نانی نے کھولا، وہ حیران ہوا۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے مکرم کو اُس سے لے لیا۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ وہ شاید اُسے اندر آنے کا کہیں، لیکن وہ بھی دروازے پر کھڑی اُسے دنیا جہاں کے قصے سنا رہی تھیں۔

''مجھے جانا ہے آنٹی!'' بلآخر اُس نے احساس دلایا۔

''ارے ہاں! تمہیں تو دیر ہو رہی ہو گی۔ چلو تم جاؤ، کوئی بات نہیں'' اب بھی اندر آنے کو نہیں کہا۔ چار و ناچار وہ گاڑی کی طرف بڑھا ایک آدھ بار مڑ کے کھڑکیوں اور بالکونی کی جانب دیکھا کہ شاید کہیں نظر آ جائے۔ پر وہ کہیں نہ دکھی، بس اُسکی نانی ہی دانت نکالے دروازے پر کھڑی تھیں۔

''مقدّس نظر نہیں آ رہی، کہاں ہے؟'' جب رہا نہ گیا تو پوچھ ہی لیا۔

''مقدّس۔۔۔ وہ تو اندر ہی بیٹھی ہے۔ بلاؤں کیا؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

''نہیں نہیں! میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' گڑ بڑا کر وضاحت دی، پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ نانی بھی اندر چلی گئیں۔ لیکن وہ نہ آئی جسکا اُسے انتظار تھا۔ بلآخر تھک کے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

مقدّس نے جب سے مکرم کی ذمے داری سنبھالی تھی، تب سے اُسکے لیے بہت آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اُسے نہ مکرم کے کھانے کی، نہ ہی سونے کی فکر کرنی پڑتی تھی اور نہ ہی آفس میں بار بار اُسکا خیال آتا تھا۔ ایک سکون تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

شروع میں جتنا وہ اخلاق کے فیصلے سے خائف تھا اب اتنا ہی ممنون ہو رہا تھا۔ اگر وہ بر وقت مقدّس کو نہ بھیجتا تو اُسکی مشکلات میں اتنی کمی نہ آتی۔ مکرم بھی بہت خوش تھا اُسکے ساتھ۔۔۔

''مجھے اُسکا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟'' دل میں سوچا۔

''یقیناً کرنا چاہیے، کیونکہ وہ حقیقتاً تمہارا بہت بڑا بوجھ بانٹ چکی ہے۔'' دل نے احساس دلایا۔

اب کیا کیا جائے؟ شکریہ کیسے ادا کروں؟ آج تو وہ آئی بھی نہیں۔ ناراض تو نہیں ہو گئی کہیں؟

لیکن مجھے اُسکی ناراضگی کی فکر کیوں ہو رہی ہے؟ خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی جواب دے رہا تھا۔

اپنی کیفیت خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ آفس آکر بھی دماغ وہیں رہا۔

اسکو پتہ تو تھا کہ میں مکرم کو چھوڑنے آیا ہوں، پھر اٹھ کر باہر کیوں نہ آئی؟

موبائل اُٹھا کر دیکھا، دوپہر ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ روزانہ اُسے میسیج کر کے بتاتی تھی کہ مکرم نے کھانا کھالیا ہے اور اب وہ سو گیا ہے۔ کبھی کبھی اُسکی کسی شرارت کی ویڈیو بنا کر بھیج دیتی۔

لیکن آج موبائل بھی خاموش تھا۔ آدھا گھنٹہ، ایک گھنٹہ، ڈھائی گھنٹے حتیٰ کہ شام ہو گئی مگر اُسکا کوئی میسیج نہ آیا۔ بار بار موبائل اٹھا کر دیکھتا، کبھی سوچتا کہ خود میسیج کر دوں۔ پھر رک جاتا۔

سارا دن اسی کشمکش میں وہ بھول گیا کہ آج پورا دن اُس نے صرف مقدّس کی فکر میں گزارا ہے۔

بلآخر اس نے واٹس ایپ کھولا اور سرچ بار میں مقدّس کا نام سرچ کرنے لگا، اور یکدم اُسکی انگلیاں تھمیں۔ اُسکے اور مقدّس کے ناموں کی سپیلنگ میں بس ایک حرف کا فرق تھا، یہاں تک کہ اردو میں بھی دونوں کی ہجے میں بس ایک ہی حرف کا فرق تھا۔ یہ ایک نہایت ہی بچکانہ سا خیال تھا لیکن اُسکے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔ اُسکا نمبر کھولا تو اُس نے ڈی پی پر مکرم کی تصویر لگا رکھی تھی۔ ہاتھوں میں چمچ پکڑے، گود میں آئس کریم کا پیالا رکھا تھا۔ چہرے پر جا بجا آئس کریم کے نشانات کے ساتھ وہ سامنے کے دو دانت نکالے ہنس رہا تھا۔ وہ تصویر واقعی بہت پیاری تھی۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اُسے نے اُسکو ایک لفظی پیغام لکھا اور موبائل رکھ دیا۔

اپنے گھر میں مکرم کے ساتھ کھیلتی مقدس کی موبائل کی سکرین روشن ہوئی۔اُس نے توجہ نہ دی۔روشن ہوتی سکرین پر مقدّم کے نمبر کے ساتھ ایک لفظی پیغام بھی نظر آ رہا تھا۔

''شکریہ''

-------+-------+-------

عثان کی خواہش پر نہ جانے عظیم اور شہباز کہاں سے ایک بکری کا بچہ لے آئے تھے؟اب وہ معصوم سا کیوٹ سا بکری کا بچہ، پناہ گاہ کے بچوں کی دلچسپی کا محور بن گیا تھا۔ سارے بچے مجمع لگائے اُس پر تبصرے کر رہے تھے۔کسی کو اُسکی آنکھوں کی فکر ہو رہی تھی، کسی کو اس بات کا دکھ تھا کہ وہ کچھ کھا کیوں نہیں رہا؟ کسی کو اس بات کی فکر تھی کہ اُسکے امی ابّو ساتھ کیوں نہیں ہیں؟ کوئی بڑی سمجھداری سے باقی بچوں کو دور رہنے کا کہہ رہا تھا کیونکہ بقول اُسکے بکری کا بچہ اتنے سارے بچوں کو دیکھ کر ڈر رہا تھا۔

قریب ہی کرسی پر رضا بیٹھا تھا، بازو سے ارمینہ چپکی تھی، جسے وہ چمچ چمچ کر کے دلیہ کھلا رہا تھا۔خلاف توقع وہ بڑے سکون سے اُسکے ساتھ لگی بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔گاہے بگاہے وہ باقی بچوں پر بھی نظر ڈال لیتا۔قریب ہی محمد چلنے کی کوشش کرتا، لڑھک کر نیچے گر جاتا۔تیرہ سالہ علیزے اُسکے ساتھ ہی تھی، اُس نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا لہٰذا اب چلنا، لڑھکنا اور گرنا اُسکا روز کا معمول بن گیا تھا۔

''دور ہٹ جاؤ، یہ تمہارا ہاتھ کھا جائیگا''عبدالرفع نے چھ سالہ منال کو پیچھے ہٹایا، وہ ہاتھ میں پتے لیے بکری کے بچے کو کھلا رہی تھی۔

''وہ ہاتھ نہیں کھاتا، گھاس کھاتا ہے''ایک بچی نے جواب دیا۔

''میں تو چاول بھی کھاتا ہوں، یہ کیوں نہیں کھاتا؟''کسی بچے کو دکھ ہوا۔

''ارے تو تم بکرے تھوڑی ہو۔''کسی اور بچی نے معصومیت سے بتایا تو باقی بچے ایسے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے جیسے بہت ہی کوئی بہترین لطیفہ سنایا گیا ہو۔

رضا مسکرایا، وہ لوگ ایسے ہی بے تکی باتوں پر قہقہے لگا لگا کر ہنستے تھے۔ رضا نے اپنے بچپن میں نہ کوئی عید منائی تھی، نہ رمضان کا اہتمام کیا تھا، نہ باقی لڑکوں کی طرح کبھی کسی بقرہ عید پر منڈی کے چکّر لگائے تھے۔ لیکن اپنے بچوں کے لیے وہ سب کرتا تھا، اُنکی ہر خواہش پوری کرتا تھا، وہ جو مانگتے تھے، اُنہیں فوراً مہیا کرتا تھا۔ یہ دکھوں کے مارے بچے تھے، وہ انکو ہر خوشی دینا چاہتا تھا۔

کھانا ختم ہو گیا تو اُس نے ارمینہ کو پانی پلایا، پھر دونوں ہاتھوں سے اُسکے بال سنوارے۔

''تمہیں بکرا دیکھنا ہے؟'' اُس نے رضا کو دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو جاؤ، سب کے ساتھ جا کر دیکھو۔'' وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتے آگے بڑھی، پھر رک گئی۔ مڑ کے رضا کو دیکھا۔ اُس نے اشارے سے اُسے آگے بڑھنے کو کہا تو وہ ہمّت کرتی بلآخر بچوں کے پاس پہنچ گئی۔ اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ اُنکے ساتھ کھیل رہی تھی۔

آج پورے مہینے بعد رضا نے اُسکے چہرے پر ہنسی دیکھی تھی، اُسکے دل سے منوں بوجھ ہٹا، اُس نے کرسی سے سر ٹکا دیا۔ پچھلے ایک مہینے سے وہ اُسے خوف کے سائے سے باہر نکالنے اور نارمل بچوں کیطرح زندگی گزارتے دیکھنے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہا تھا۔ بلآخر آج اُسے کامیابی مل گئی تھی۔

اُسکا ذہن کہیں اور پہنچنے لگا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، ہسپتال کے یخ بستہ ماحول میں بدلنے لگے۔ وہ ہسپتال کے کمرے کے دروازے پر تھا۔ اُسکے قدم باہر کی طرف تھے کہ تب کسی نے پُکارا۔

''رضا!۔۔'' وہ رکا، پلٹا اور نوید کو دیکھا۔ باقی تینوں باہر نکل گئے۔

''تم سے کچھ بات کرنی ہے'' نوید نے کہا تو وہ حیران ہوتا اُس تک آیا۔ ڈاکٹر دوسری جانب ہو کر ایکس رے رپورٹ دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' سنجیدگی سے پوچھا۔ جانتا تھا کہ اسکو کیا بات کرنی ہو گی۔

''آج جو ہوا اُسکے لیے معذرت چاہتا ہوں'' اُسکے کے لہجے میں شرمندگی کا عنصر نمایاں تھا۔

''تم کیوں معذرت کر رہے ہو؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''شک تو میں نے بھی کیا تھا تم پر؟''

''وہ تمہاری پیشہ ورانہ ذمے داری تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم مجھے خلیل کے ساتھ دیکھتے تو اس طرح کا تماشا لگانے کے بجائے مجھ سے اکیلے میں پوچھ لیتے۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔'' وہ جتنی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، اتنا ہی نوید شرمندگی کے دلدل میں دھنس رہا تھا۔ علی نے غلط کیا تھا۔۔۔ بہت غلط۔۔

''علی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اُسے۔۔'' وہ کچھ بولنا چاہتا تھا۔ شاید اُسکی کی طرف سے بھی معذرت کرنا چاہتا تھا کہ اچانک ہی رضا نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسکی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' پھر اُسکا کندھا تھپتھپاتے ہوئے باہر چلا گیا، وہ دکھی ہوا۔

رضا نے حقیقتاً بہت ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اُسے جواب دے سکتا تھا، مگر اس نے نہیں دیا۔ اُسکے پاس اچھا موقع تھا، چاہتا تو اُسی لمحے اُسکی تذلیل کر سکتا تھا مگر چپ رہا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اُس نے دس سال پرانی دوستی کا پاس رکھ لیا تھا۔ اور یہ وہ شے تھی جو علی کو نظر نہیں آئی تھی۔ پر نوید کو نظر آ گئی تھی۔ پچھلی تین ملاقاتوں میں اُس نے جو اجنبیت اپنے اوپر طاری کر رکھی تھی، آج وہ اجنبیت کہاں گئی؟ کیسے وہ صرف ایک خبر سن کر، ہسپتال دوڑا چلا آیا تھا۔ وہ آیا تھا۔۔۔ اور صرف نوید کے لیے آیا تھا۔

''یہ بلکل آپ کے جیسا ہے۔ دیکھو اسکی بھی آپکی جیسی چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں ہیں۔ چھوٹی سی ناک ہے اور کیوٹ بھی آپکے جتنا ہے'' جزا کی آواز پر وہ ماضی سے باہر آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ تین سالہ ولید کو گود میں لیے بکری کے بچے کے قریب پنجوں کے بل بیٹھی تھی۔ ولید اُس سے ڈر رہا تھا شاید، تو وہ اُسے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کتنا بے ضرر اور معصوم ہے۔ رضا کو یہ منظر بڑا پیارا لگا۔

''لیکن اُسکی ناک بڑی ہے۔'' ولید کو اعتراض ہوا تو وہ ہنس پڑی۔ اُسے یاد آیا کہ پچھلی بار وہ یہاں سے ناراض ہو کر گئی تھی۔ لہٰذا اُٹھ کر اُسی کے پاس چلا آیا۔

''اچھا! لیکن اسکے دانت تو آپکے جیسے ہیں، چھوٹے چھوٹے سے۔۔'' بات کرتے ہوئے اُسکے نظریں گھاس پر سفید جوگرز میں مقید پیروں سے ہوتی اُسکے سر پر کھڑے، مُسکراتے ہوئے رضا تک گئیں۔ آج وہ گھر پر تھا، اسی لیے فورمل حلیے کے بجائے بلیو جینز پر بلیک ہڈی پہنے کھڑا تھا، ہڈ کندھوں پر تھا۔ جزا نے اسکو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

''محترمہ جھانسی کی رانی! کیا آپ سے بات ہو سکتی ہے؟'' شرافت سے پوچھا تو اس خطاب پر اُس نے سلگ کر اُسے دیکھا۔

''کیا ہے؟'' لٹھ مار انداز میں کہتی کھڑی ہوئی۔

''پولیس والوں نے دوبارہ تو تنگ نہیں کیا؟'' اُس نے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں۔'' مختصر جواب دیا۔ ظاہر کیا کہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے، بہتر ہو گا کہ وہاں سے چلتا بنے۔

''چلو اچھا ہوا، یقیناً تم سے ڈر گئے ہوں گے۔'' وہ بھی ٹک کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

''میں وہاں سے گزری نہیں ہوں اب تک، اسی لیے ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔'' اُس نے جتایا۔

''دیکھا میں نے کہا تھا ناں کہ کچھ دن اُس راستے سے نہ گزرو۔'' جزا کے تو سر پر لگی تلوؤں پر بجھی۔

''میں اسی لیے وہاں سے نہیں گزری کہ مجھے فلحال کوئی کام نہیں تھا وہاں، لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں وہ راستہ استعمال نہیں کروں گی۔ ڈر کر گھر بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' سختی سے جواب دیا۔

''جزا!'' اب کہ وہ بھی سنجیدہ ہوا۔ ''تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کچھ معاملات مصلحت کے تحت حل کیے جاتے ہیں۔'' وہ سمجھانا چاہ رہا تھا لیکن وہ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''تم۔۔'' اس سے پہلے وہ کچھ کہتی بیل بجی، عائشہ جی نے دروازہ کھولا تو وہی عورت اندر داخل ہوئی جو کچھ دنوں پہلے بھی یہاں آئی تھی۔

''فریحہ۔۔۔'' دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رضا اُسے دیکھ کر سیدھا ہوا۔ پرپل رنگ کے ٹو پیس سوٹ میں جسکے سرے سے بازو ہی نہیں تھے، اسٹیپس کٹنگ بالوں کو کھلا چھوڑے وہ دروازے سے ہی ہاتھ ہلاتی اندر داخل ہوئی تھی۔ جزا نے چہرہ گھما کے رضا کو دیکھا۔ آج پھر اُسکے چہرے پر خوشگوار حیرت نظر آئی تھی۔ وہ گفتگو درمیان میں چھوڑ کر آگے بڑھا اور اُسکے پاس چلا آیا۔ جزا سے معذرت بھی نہیں کی، اُسے ساتھ آنے کو بھی نہیں کہا۔ اب وہ دونوں ہی اُسے کچھ دور ایک دوسرے سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اُسکے چہرے پر ناگوار سا تاثر اُبھرا، اُنکی طرف سے چہرہ موڑ کر رخ پاس کھیلتے بچوں کی جانب کر دیا۔

''جزا!'' اُسی لمحے عائشہ جی اُسکے پاس آئیں۔

''جی؟''

''بیٹاذراولید کومجھے دینا۔فریحہ کے پاس لیکر جاناہے۔''اُنہوں نے کہاتواس نے ناسمجھی سے ولید کواُنکے حوالے کر دیا۔ پچھلی بار بھی جب آئی تھی،توولید سے ملی تھی۔

''کون ہے یہ خاتون؟اور ولید سے کیوں ملتی ہے؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔رضاب سنجیدگی سے فریحہ کی کوئی بات سن رہاتھا۔

''یہ ولید کی ماں ہے۔''اُنہوں نے جیسے انکشاف کیا۔

''سگی ماں؟''وہ حیران ہوئی۔

''ہاں!''

''توولید کو یہاں کیوں چھوڑاہواہے؟''

''ولید کاباپ مر گیاتھا،فریحہ کے باپ بھائیوں نے اُسکی شادی زبردستی ایک امیر آدمی سے کروادی۔اب نہ وہ آدمی ولید کو ساتھ رکھنے پر تیار ہے نہ فریحہ کے گھر والے۔بیچاری بہت مجبور ہے، پچھلے تین سالوں سے اپنے شوہر کوراضی کرنے کی کوشش کررہی ہے۔وہ بھی ڈھیٹ آدمی ہے مان کرہی نہیں دیتا۔جب کبھی کسی بزنس ٹرپ(کاروباری دورے)پر ملک سے باہر جاتاہے تویہ بیچاری اپنی ممتاٹھنڈی کرنے اسے اپنے گھر لیجاتی ہے۔پھر شوہر کی واپسی سے پہلے اُسے واپس یہاں چھوڑ جاتی ہے۔بہت روتی ہے اپنے بچے کے لیے۔۔۔''وہ دکھی لہجے میں بتارہی تھیں۔

''تویہ شادی شدہ ہے؟''جزانے ساری باتوں کے جواب میں بس اتناہی کہا۔

''ابھی تک تو۔۔۔''اُنکے جواب پر وہ چونکی۔

''مطلب؟''

''اس نے کچھ کاروبار اپنے نام پر بھی شروع کیا ہے، اب اپنے بچے کے لیے اپنے شوہر پر انحصار نہیں کرتی۔ کہہ رہی ہے کہ اس بار یا تو اپنے شوہر کو راضی کریگی یا طلاق لے لے گی۔ لیکن اب ولید کو مزید خود سے دور نہیں رکھے گی۔''اُنھوں نے بتایا تو پتہ نہیں کیوں؟ پر یہ بات اُسے بری لگی تھی۔

رضا نے عائشہ جی کو بیٹھے بیٹھے اشارہ کیا تو انہوں نے سر ہلایا اور ولید کو لیے آگے بڑھ گئیں۔ فریحہ اب اپنے بچے سے مل رہی تھی۔ عائشہ جی بھی انہی کے ساتھ، پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ جزا کو اپنا آپ وہاں اضافی لگنے لگا تو خاموشی سے اندر چلی آئی۔

اُسے بنا کسی وجہ کے ہی فریحہ سخت بری لگی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو۔ جس طرح کے حالات عائشہ جی نے اُسکے بتائے تھے، اپنے چہرے سے تو وہ کہیں سے بھی ایسے حالات کی ماری عورت نہیں لگتی تھی۔ اللہ جانے وہ سچ کہہ رہی تھی یا جھوٹ؟

وہ خاموشی سے بچوں کی کاپیاں لیکر بیٹھ گئی۔ اب اُسے کوئی شے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

----------+---------+--------

لان میں رکھی میز کے گرد عائشہ جی، رضا اور فریحہ بیٹھے تھے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ ولید فریحہ کی گود میں تھا۔ رضا کی نظریں بار بار بھٹک کر گھر کے دروازے تک جاتیں جہاں سے جزا اندر گئی تھی پر دوبارہ باہر نہیں آئی۔ لاشعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ وہ خود یہاں آئے اور اُس خالی رکھی چوتھی کرسی پر بیٹھے، فریحہ سے ولید کے متعلق بات کرے۔ آخر کو وہ اُسکی استاد تھی۔ لیکن اُسے نہ آنا تھا وہ نہ آئی۔

''رضا! تم سے ایک بات کہنی تھی''فریحہ نے اُسے مخاطب کیا تو وہ اُسکی جانب متوجہ ہوا۔

''کہو!''

''میں اپنے شوہر کو راضی کر رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ شاید اس بار وہ مان جائے۔ جیسے ہی وہ راضی ہو جائیگا میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گی ولید کو لینے میں۔۔۔اس لیے اگر تم۔۔''وہ رکی، رضا سمجھ گیا۔ فوراً عائشہ جی کی جانب چہرہ کیا اور کہا۔

''عائشہ جی! فریحہ جس وقت بھی ولید کو لینے آئے۔ چاہے میں یہاں ہوں یا نہ ہوں، ولید کو اُسکے حوالے کر دیجئے گا۔ مجھے بس اطلاع کر دیجئے گا۔ اس بات کی پرواہ مت کیجئے گا کہ میں نے فون اٹھایا یا نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ فضول کی فورمالیٹی (رسومات) کی وجہ سے کوئی ماں اپنی اولاد سے دور رہے۔''

''ایسا ہی ہوگا رضا!'' عائشہ جی نے یقین دلایا۔

''تمہارا بہت شکریہ! اللہ تمہیں اسکا بہت اجر دیگا۔ تم نے میری بہت مدد کی ہے'' وہ نم آنکھوں سے بولی تو وہ مسکرا دیا۔

----------+---------+--------

''ویسے ناشتا کیوں نہیں کیا آج؟'' عمر نے اُسکے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بس آج دل نہیں کر رہا تھا بنانے کو''

''کیا مطلب؟ تم خود ناشتا بناتے ہو؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں!''

''کیوں؟ اکیلے رہتے ہو؟''

''ایسا ہی سمجھ لو'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سولہ سال پہلے کی ایک صبح، جب اُس نے رضا سے یہ سوال کیا تھا، وہ اُنکی دوستی کا آغاز تھا۔

''اتنا اُداس کیوں رہتے ہو؟'' عمر نے اس سے پوچھا تھا۔

''کون میں؟''

''ہاں''

''نہیں نہیں۔۔۔ میری فطرت ہی ایسی ہی شاید۔'' اس نے ہنستے ہوئے اسکی غلط فہمی دور کرنی چاہی تھی۔

آوازیں یاد بن کے اُسکے کانوں میں گونجی تھیں۔ زندگی کتنی خوبصورت تھی؟ دل کرتا تھا کوئی ہوا چلے اور اٹھا کے اُسے ماضی میں چھوڑ آئے۔ وہ وہیں رہے اور مستقبل کبھی نہ آئے۔

ہاتھوں میں موبائل لیے عمر، شیراز کا میسیج دیکھ رہا تھا۔ اپنے کہے کے مطابق اُس نے رات ہی اُسے نوید کا نمبر بھیج دیا تھا۔ لیکن چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی عمر اُس سے کچھ نہ پوچھ سکا تھا۔ نظریں نوید کے نمبر پر تھیں اور ذہن کے نہاں خانوں میں رضا کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ تب بھی اُسے جان نہ سکا تھا اور آج بھی۔۔۔

آج کل اُسے اپنے دوست بہت یاد آتے تھے، پرانی باتیں، ساتھ گزارے ہوئے تمام لمحات یاد آتے تھے۔ دس سالوں میں جن لوگوں کو اُس نے ماضی کا حصّہ بنا کے یادوں کے صندوق میں بند کر دیا تھا، وہ اب اُسکے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے، وہ ماضی سے پھر حال بن گئے تھے۔ اُنہیں سامنے دیکھ کر، اُن سے مل کر اب وہ خود ماضی سے باہر نہیں آ پا رہا تھا۔ پتہ نہیں تقدیر کیا چاہتی تھی؟

بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے بلآخر نوید کو اپنا نام میسیج کیا۔ پھر اگلے میسیج میں اُس سے اُسکا حال پوچھا۔ اگر ایک دہائی پہلے اُسے نوید کو میسیج کرنا ہوتا تو وہ کبھی بھی اتنی سوچ بچار نہ کرتا۔ لیکن آج ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔ خلا باقی تھا۔

اُسے میسیج کیے منٹ بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ وہاں سے فوراً ہی جواب آیا۔

"جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بلکل ٹھیک ہوں اور آفس میں ہوں۔ بلاوجہ ہی پریشان ہو رہے ہو۔" اُسکے تسلی دینے کا انداز ایسا تھا کہ وہ ہنس پڑا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اُس نے بس اتنا ہی لکھا۔ پھر کچھ سوچ کر دوبارہ میسیج ٹائپ کرنے لگا۔

"تم سے ایک کام تھا۔"

"بولو۔۔"

"رضا کے گھر کا ایڈریس مل سکتا ہے؟"

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میرے پاس اُسکا ایڈریس ہو گا؟" سوال معقول تھا۔

"ایف آئی اے آفیسر ہو، معلوم تو کر سکتے ہو۔" اُسکا جواب بھی کافی معقول تھا۔

"تم بھی علی کی طرح شک کر رہے ہو اُس پر؟" اُس نے پوچھا تو عمر مسکرایا۔

’’نہیں! ملنا چاہتا ہوں اُس سے‘‘ اور اگلے ہی لمحے رضا کا ایڈریس اُسکے پاس آ چکا تھا۔

’’تھینکس‘‘، شکر ادا کرنا ضروری تھا۔ اُس نے جواب نہیں دیا اور آف لائن ہو گیا۔ اب وہ صوفے سے ٹیک لگائے لوکیشن سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

----------+---------+--------

فریحہ ولید کو ایک ہفتے کے لیے ساتھ لے گئی تھی۔ ولید پچھلے تین سال سے اُسکے ساتھ تھا، جب فریحہ اُسے رضا کے پاس چھوڑ کر گئی تھی تب وہ چار ماہ کا تھا، وہ پناہ گاہ میں آنے والے اب تک کے تمام بچوں میں سب سے کم عمری میں یہاں آیا تھا۔ رضا کو وہ بہت پیارا تھا۔ جب بھی فریحہ اُسے اپنے ساتھ لیکر جاتی، وہ اُسے بے انتہا یاد کرتا تھا۔ لیکن وہ خود کو اس جدائی کا عادی بنا رہا تھا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ولید اپنی ماں کے پاس واپس چلا جائیگا۔ فریحہ ولید کو لے گئی تو وہ باہر آ گیا۔ بنا کسی وجہ کے وہ سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ جزا بھی اس سے ملے بنا ہی چلی گئی تھی، پتہ نہیں وہ اتنا ناراض کیوں تھی؟

جزا کا خیال آیا تو آپ ہی آپ مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوئی۔ آج وہ پیازی رنگ کا گھیر دار فراک پہنے ہوئی تھی۔ لباس کی ہم رنگ شال کندھوں پر ڈالے وہ ٹھیک ٹھاک تپی ہوئی تھی۔

’’اُن پولیس والوں کا کچھ کرنا ہوگا۔‘‘ دل میں سوچا۔ ذہن میں یاداشت کے گھوڑے دوڑائے اور ہر وہ تعلق یاد کرنا چاہا جو اس وقت اُن پولیس والوں کی عقل ٹھکانے لگانے کے کام آ سکتا تھا۔ بہت لوگ تھے جو اُسکے لیے یہ کام کر سکتے تھے۔ ایک رہائشی علاقے میں سڑک کنارے اُس نے گاڑی روک دی اور جیب سے موبائل نکالا کر اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے، کانٹیکٹ لسٹ کھنگالنے لگا۔ ابھی اُسکی تلاش جاری ہی تھی کہ خاموش فضا میں کسی عورت کے رونے اور مرد کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اُسکی انگلیاں تھمی، چہرہ اٹھا کر اچھنبے سے آس پاس دیکھا، اور اُسی گلی کے آخری گھر کے دروازے پر جو منظر اُسے نظر آیا تھا، اُس نے اُسکے حواس سلب کر دیئے تھے۔ موبائل اُسکے ہاتھوں سے ڈیش بورڈ پر گرا تھا۔

وہ مرد اپنی بیوی کو برا بھلا کہتا، چن چن کر غلیظ الفاظ استعمال کرتا اُسے بازوں سے پکڑے دروازے سے باہر نکال رہا تھا۔ یہ سوچے بنا کہ آس پاس کے کچھ گھروں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں پر لوگ کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ مرد کے قریب ہی سات آٹھ سال کا بچہ، ڈرا سہما، خوفزدہ سا کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

وہ عورت اُسکے پاؤں پر گر گئی، بچہ گھبرا کر عورت سے چپک گیا۔ مرد نے اُسے خود سے پرے کیا اور بچے کو تقریباً اُس سے چھینتے ہوئے اندر کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ عورت دروازے پر ہی بیٹھ کر بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ اپنے اپنے گھروں سے جھانکتے لوگ بھی اب افسوس کرتے اندر چلے گئے تھے۔ کوئی بھی اُس سے ہمدردی کرنے نہیں آیا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور عورت کی سسکیاں پورے علاقے میں گونج رہی تھیں۔

رضا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بھی کرنے کے بارے میں سوچتا، اُسی گھر کا دروازہ دوبارہ کھلا، اور ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا۔ اُس نے عورت کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اندر لے گیا۔ اور اُسکے بعد ہر جانب خاموشی چھا گئی۔ رضا کا دم گھٹنے لگا تھا۔

وہ جانتا تھا اُس مرد کو۔۔۔ اچھے سے جانتا تھا۔

لیکن وہ ایسا نکلے گا؟ یہ اُمید نہ تھی اُسے۔

سرد موسم ہونے کے بعد بھی اُس نے گاڑی کا اے سی آن کر دیا تھا۔

بچے کی آنکھوں میں طاری خوف۔۔۔ یہ خوف اُسے شناسا سا لگا تھا۔ کیسے نہ لگتا؟ اُسکی ماں بھی تو ایسے ہی روتی تھی، اُسکا باپ بھی تو ایسے ہی غلیظ الفاظ اُسکے لیے استعمال کرتا تھا۔ اور وہ بھی تو اسی طرح اپنی روتی بلکتی ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اُسکی دادی بھی تو ایسے ہی آکر اُسکی ماں کی دلجوئی کرتی تھیں، جیسے اُس بوڑھے آدمی نے آکر اُس عورت کی، کی تھی۔ کہانی وہی تھی، کردار بدل گئے تھے۔

تو کیا تقدیر ایک اور رضا کو پروان چڑھانے والی تھی؟

----------+---------+--------

صبح کے بعد اُسکا عمر سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ آفس سے بھی وہ اُس سے ملے بنا ہی نکل آیا تھا، ذہن منتشر تھا۔ اپنے اوپر چڑھایا ہوا حقیقت پسندی کا خول چٹخنے لگا تھا۔ گھر آیا تو عمر کا میسیج موبائل سکرین پر جگمگاتا نظر آیا، کھول کر دیکھا تو اس نے نوید کا نمبر بھیجا تھا۔ کہا کچھ بھی نہیں، لیکن علی سمجھ گیا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ وہ چاہتا تھا کہ وہ نوید سے خود ہی بات کر لے۔

لیکن کیسے کرے؟ کس طرح؟

تم نے نوید کی دوستی کا بھرم بھی نہیں رکھا تھا، دس سال پہلے تم نے اُسکے ساتھ بھی یہی کیا تھا؟

عمر کے الفاظ یاد آئے۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا وہ، جو کچھ اس نے نوید کے ساتھ کیا تھا، کیا اُسکے بعد بھی وہ اتنے آرام سے اُسے کال کر کے اُسکا حال احوال دریافت کر سکتا تھا؟ کیا اتنا آسان تھا؟ پھر جس طرح کل حسین نے پوچھا تھا کہ ''لے لیا تم نے اپنا انتقام؟'' وہ تو وہیں زمین میں گڑ گیا تھا۔ وہاں کھڑے ہر شخص نے اُسکے بارے میں کیا سوچا ہو گا؟ کیا سمجھا ہو گا اُسے؟ ایک انتقام کی آگ میں اندھا شخص؟ لیکن وہ تو اُنھیں بھلا چکا تھا نہ؟ تو اُسے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ اُسکے بارے میں جو بھی سوچیں؟ لیکن اُسے فرق پڑ رہا تھا۔ وہ پریشان ہو رہا تھا۔

ذہنی طور پر وہ اس حد تک تھکا ہوا تھا کہ اُس نے کپڑے بھی تبدیل نہ کیے، آفس والے لباس میں ہی صوفے سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا۔ اُس نے صبح ناشتہ نہیں کیا تھا، دوپہر میں لنچ بھی نہیں کیا اور اب گھر آ کر رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ پچھلے اٹھارہ گھنٹوں سے بھوکا پیاسا گھوم رہا تھا، ذہن منتشر تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ جب اُسے بیل بجنے، اور دروازہ کھل کر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اُسکے بعد خاموشی سی چھا گئی۔ جب بہت دیر اسی طرح خاموشی سے گزرے، تو اُسے کسی ان ہونی کا احساس ہوا۔ وہ کھڑا ہوا، اپنا کوٹ اُتار کے صوفے پر پھینکا اور آستینیں موڑتا باہر آیا۔ اور وہی ہوا، جسکا اسے ڈر تھا۔ اُسکے بد ترین خدشے کی تصدیق ہو چکی تھی۔

فاطمہ سامنے تھی اور احمد کو اپنے ساتھ لگائے اُسے چوم رہی تھی۔ حیرت اُسے اس بات کی تھی کہ احمد بھی اُسکے گلے لگا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ علی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ سب سے پہلے سفیر صاحب کی نظریں اُس پر پڑیں، اُنکے ہاتھ کانپے، دِل لرزہ۔۔۔

''آ۔۔ علی۔۔۔ وہ۔۔ میں نے۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ فاطمہ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا وہ لہو رنگ آنکھوں سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر کھڑی ہوئی۔

''ذلیل عورت!۔۔۔ میں نے منع کیا تھا نہ تمہیں؟'' فاطمہ کا چہرہ سرخ ہوا۔ وہ قدم قدم اٹھاتے اُسکی طرف بڑھ رہا تھا۔

''علی! میری بات سنو! میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔'' سفیر صاحب بیچ میں آنا چاہتے تھے لیکن وہ فاطمہ کا بازو دبوچ چکا تھا۔

''منع کیا تھا نہ میں نے۔۔۔ کہا تھا دور رہو میرے بیٹے سے۔'' وہ حلق کے بل چیخا تھا۔

''علی!۔۔ علی میں۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''نام مت لو اپنی غلیظ زبان سے میرا۔'' وہ اُسکی بات کاٹتے ہوئے چیخا تھا۔

''میں بس اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ میری بھی اولاد ہے۔ میں نے پیدا کیا ہے اسے، ماں ہوں میں اِسکی۔'' بلآخر وہ چیخ اُٹھی۔ علی کے تو دماغ پر لگے تھے اُسکے الفاظ۔ احمد سہم کر کبھی ماں کو تو کبھی باپ کو دیکھ رہا تھا۔

''ایسے نہیں سمجھو گی تم، تمہارے جیسی حرافہ اور آوارہ عورتوں کو عزت کی زبان راس نہیں آتی۔'' فاطمہ کو اپنے کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے علی اُسے گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لیجانے لگا۔

''نہیں!۔۔۔ نہیں علی! میری بات سنو! ایک مرتبہ سن لو پھر جو چاہے کرنا۔'' وہ اُسکے ساتھ گھسیٹتی منت کر رہی تھی۔ پر وہ سن کہاں رہا تھا؟

''علی! ایک مرتبہ اُسکی بات سن لو، اُسکے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ ہے۔'' سفیر صاحب بھاگتے ہوئے اُسکے پیچھے آ رہے تھے۔

''آپ بیچ میں نہیں آئینگے۔'' لہو رنگ آنکھیں اٹھا کے اُس نے اپنے باپ کو دیکھا۔

''بابا! نہیں۔۔۔ بابا پلیز'' اُسکا بیٹا بلک بلک کر روتا اُسکے پاؤں سے لپٹا تھا۔

''اندر جاؤ تم۔۔۔'' اُس نے چیختے ہوئے اُسے پیچھے دھکیلا۔ رات کے اس پہر اچھا خاصا شور شرابہ مچ چکا تھا۔

''علی! نہیں۔۔۔ تمہیں میری بات سننی ہوگی۔'' وہ چیخ رہی تھی۔ لیکن وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے مرکزی دروازے تک لایا، پاس رکھے گملے پر اُسکا پاؤں لگا اور وہ ٹوٹ گیا۔ علی نے پرواہ نہ کی اور اسی طرح اُسے گھسیٹتے ہوئے دروازے سے باہر دھکا دیا۔ گملے سے اُسکا پاؤں زخمی ہوا تو وہ سسک اٹھی تھی۔

''علی! خدا کے لیے رک جاؤ بیٹا!۔۔۔'' سفیر صاحب دل پر ہاتھ رکھے رو دیئے تھے۔ احمد منع کرنے کے باوجود باہر آ گیا تھا۔

''تمہارے جیسی پنچ قماش کی عورت کی یہی اوقات ہے۔'' اُسے دروازے سے باہر تقریباً پھینکتے ہوئے وہ چیخا تھا۔ اُسکے حواس ساتھ دیتے تو اُسے کچھ احساس ہوتا کہ وہ اپنے ہی گھر کا تماشا محلے میں لگا چکا ہے۔

''علی! ایک بار سن لو، ایک بار۔۔۔ایک بار میری بات سن لو'' وہ اُسکے پاؤں پڑی تھی۔ اُس نے اپنے پاؤں پیچھے کیے۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے، اپنا مکروہ چہرہ لیکر اُنہی لوگوں کے پاس جاؤں جن سے اپنی قیمتیں لیتی رہی ہو۔'' اس بات پر وہ ساکن ہو گئی۔ احمد روتا ہوا کب وہاں آیا اور کب اُسکے گلے لگا؟ اُسے معلوم نہ ہو سکا۔

''امی۔۔۔امی'' وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اور علی ٹھہر گیا۔ یہ کیسے ہوا تھا؟ اُسکا بیٹا اس عورت کو اپنی ماں کیسے کہہ رہا تھا؟ اگلے ہی لمحے نفرت کا اُبال اٹھا تھا اُسکے اندر، اس نے احمد کو جھپٹ کر اُس سے الگ کیا اور اندر گھسیٹتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

''نہیں! مجھے امی کے پاس جانا ہے۔ امی۔'' وہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ خود کو چھڑوانے کی جتنی کوشش کر سکتا تھا کر رہا تھا۔

''نہیں ہے وہ تمہاری ماں۔'' اُس نے ایک زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر جڑ دیا تھا۔ اور ایسا آٹھ سالوں میں پہلی بار ہوا تھا کہ اُس نے احمد پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے گرا، سفیر صاحب بھاگ کر اُسکے پاس آئے اور اُسے اٹھا کر اپنے ساتھ لگایا۔

''پاگل ہو گئے ہو علی؟ کیوں مار رہے ہو بچے کو؟''

''ہاں! ہو چکا ہوں میں پاگل۔۔۔ مجھے پاگل بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے آپ سب نے۔'' وہ چیختے ہوئے بولا تھا۔ اُسکی ذہنی حالت اس وقت ابتر ہو رہی تھی۔

''آپ نے بلایا نہ اُسے؟ کیوں کیا ایسا؟ کیوں؟'' اگلے ہی لمحے سفیر صاحب اٹھے اور ایک زوردار تھپڑ اُسکے چہرے پر دے مارا۔ شاک صدمہ، اور شدید بے یقینی سے اُس نے اُنہیں دیکھا تھا۔ اُسکی زندگی میں بھی یہ پہلی بار ہی تھا جب اُسکے باپ نے اُسکے اوپر ہاتھ اٹھایا تھا اور وہ بھی اُسکی اولاد کے سامنے۔

''اب میری بات کان کھول کر سنو، میں اُسے اندر لیکر آرہا ہوں۔ تمہیں اُسکی بات سننی ہو گی۔ اُسکے بعد وہ دوبارہ کبھی یہاں نہیں آئیگی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔'' آج بہت عرصے بعد انہوں نے اُسی سخت لہجے میں اُس سے بات کی تھی، جیسے وہ کسی زمانے میں اس سے کیا

کرتے تھے۔ اُسکے بعد وہ اُسکے سامنے ہی دروازے تک گئے، فاطمہ کو اٹھایا اور اندر لے کر آئے۔ وہ اُسی طرح ساکت و جامد کھڑا رہا۔ فاطمہ کو اندر آتا دیکھ کے احمد بھاگتے ہوئے اُسکے پاس گیا اور اس سے لپٹ گیا۔

''امی!۔۔۔'' علی نے کرب سے آنکھیں میچیں۔

''میرا بیٹا! میرا احمد۔۔۔'' وہ روتے ہوئے اُسے پیار کر رہی تھی۔ اُس کی برداشت جواب دے گئی تو وہ اُسکی جانب مڑا۔

علی! دیکھو۔۔۔ مجھے میرے بیٹے سے ملنے دو۔ بدلے میں میرے پاس تمہیں۔۔۔'' اُسے اپنی جانب دیکھتا پا کر فاطمہ نے دوبارہ اُس سے منت کرنے کی کوشش کی۔

''احمد! کیا تم اس عورت کے ساتھ رہنا چاہتے ہو؟'' اُس نے فاطمہ کی بات کاٹتے ہوئے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔ وہ ڈر کر فاطمہ کے پہلو میں چھپا۔

''میں نے کیا پوچھا ہے؟ بابا کے ساتھ رہنا ہے یا اسکے ساتھ؟'' سفیر صاحب کا دماغ بھک سے اُڑا تھا۔ یہ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے احمد کی آواز اس گھر میں گونجی تھی۔ اور پچھلے آٹھ سالوں میں اس بچے نے پہلی بار اس طرح تیز لہجے میں کوئی بات کہی تھی۔

''مجھے امی چاہیے۔۔۔ صرف میری امی'' علی کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

''احمد! کیا تم بابا کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے؟ اگر تمہیں امی چاہیے تو پھر تمہیں بابا کو اور اس گھر کو چھوڑنا ہو گا۔ اپنا روم، اپنی چیزیں چھوڑنی ہو گی۔'' وہ آٹھ سال کے بچے کو فیصلے کا اختیار دے رہا تھا۔ بے بس ہو رہا تھا۔۔۔ بے یقین ہو رہا تھا۔۔۔

''علی! کیسی بات کر رہے ہو؟ بچہ ہے وہ۔۔۔'' سفیر صاحب اُسے روکنا چاہتے تھے۔

''میں کچھ پوچھ رہا ہوں احمد!'' وہ دھاڑا۔

''نہیں رہنا چاہتا میں آپکے ساتھ۔۔۔ نہیں چاہیے آپ مجھے۔۔۔ آپ گندے ہیں، بہت برے ہیں آپ۔'' وہ چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے اُسکا سانس رک گیا ہو۔

''مجھے میری امی چاہیے بس، مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا۔ آپ اچھے نہیں ہیں۔'' وہ بولے جا رہا تھا اور وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ اُسے دیکھ رہا تھا۔ یہ آخری شے تھی جو وہ تصوّر کر سکتا تھا۔ اُسکے لیے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔

''امی! مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ پلیز'' اب وہ بلک بلک کے فاطمہ کی گود میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔ علی نے آنکھوں میں آئی نمی کو اندر دھکیلا اور گہرا سانس لیکر خود کو کمپوز کیا۔

''میں جا رہا ہوں۔ میرے واپس آنے تک اپنا سامان پیک کر لو۔ میں واپس آؤں تو تم دونوں ہی گھر پر نہیں ملنے چاہیے ہو مجھے'' یہ بات اُس نے اپنے بیٹے کے لیے کہی تھی۔ اپنی اولاد کے لیے۔۔۔اور کہہ کر وہ رکا نہیں تھا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے نکل گیا۔

یہ آخری خنجر تھا جو قسمت نے پوری قوت کے ساتھ اُسکے دل میں گھونپا تھا۔ اُسکی ایک اولاد کو فاطمہ نے قتل کیا تھا اور دوسری کو آج وہ خود چھوڑ آیا تھا۔

پس ثابت ہوا کہ علی سفیر سے کوئی محبت نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔۔ کوئی ایک بھی نہیں۔۔۔

وہ محبت کے قابل ہی نہ تھا، وہ کسی کو اپنا نہیں بنا سکا تھا۔ نہ باپ، نہ دوست، نہ بیوی اور نہ ہی اولاد۔

اُس کی قسمت میں کڑھنا تھا، گھٹنا تھا اور ایک دن ایسے ہی گھٹ گھٹ کر مر جانا تھا۔

وہ ساری رات علی سفیر نے سڑکوں پر گزاری تھی، آج اگر نوید کہیں سے آکر اُسے کہتا کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرو تو وہ شاید زندگی ہی ختم کر دیتا۔

ایسی زندگی کا کیا فائدہ جو کسی کام کی نہ تھی؟

---------+---------+--------

خلیل مر گیا تھا یا اپنے گھر میں مردہ پایا گیا تھا۔ اُسکی موت کا کوئی سراغ نہیں مل پا رہا تھا۔ فرمان تک پہنچنے کا ایک وہی راستہ تھا، اس بار اُنہوں نے ہر طرح کی احتیاط کی تھی۔ لیکن سب بے سود۔۔۔

''سر! آپ نے جو کہا تھا وہ ٹھیک نکلا۔'' وہ سوچوں میں غرق تھا جب شیراز نے اُسکے پاس آتے ہوئے اطلاع دی۔ لمحوں میں اُس نے اُسکی بات کا مفہوم سمجھا تھا۔

''کیا مطلب سچ ہے؟ تم نے کیا کیا پھر؟'' اُسکے ماتھے پر بل پڑیں۔

''اُنکی جانب سے دوبارہ کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ دوبارہ کچھ ہو تو اطلاع دینا۔'' شیراز نے کہا۔

''ہوں ہہ۔۔'' اُس نے سر ہلایا پھر قریب بیٹھے فیصل کو دیکھا۔

''فیصل۔۔۔'' اُسے اپنے پاس بلایا۔

''جی؟'' وہ قریب آیا۔

''تمہیں ایک کام کرنا ہے۔ ایک آدمی ہے اُس پر نظر رکھنی ہے تمہیں۔'' نوید نے کہا۔

''کس بندے پر؟'' اُس نے پوچھا۔

''تفصیل تمہیں شیراز بتا دیگا۔ تم نے کرنا یہ ہے کہ اُسکے کسی بھی غلط قدم سے پہلے مجھے اطلاع دینی ہے۔'' نوید کی بات سن کر اُس نے سر ہلایا اور پھر شیراز کے ساتھ اُسکی ٹیبل پر جا کھڑا ہوا۔

وہ دونوں تفصیل سے گفتگو کر رہے تھے، اُنہیں دیکھتے نوید کا ذہن اس وقت بھٹک کے کہیں اور جا چکا تھا۔

''اُس نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ کیوں؟'' ایک ہی سوال دماغ میں گونج رہا تھا۔

----------+---------+--------

وہ آج پھر پناہ گاہ نہیں گیا تھا۔ دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی، تو اپنے فلیٹ چلا آیا۔ سرد موسم کے باوجود اُسے اتنی گرمی لگ رہی تھی کہ ہڈی اُتار کے پاس رکھی میز پر رکھ دی اور خود کاؤچ پر گر گیا۔ گھٹن کم نہ ہوئی تو پنکھا بھی چلا دیا۔ پھر جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی اور منہ سے لگالی۔

اُسے علی ناپسند تھا۔ شدید ناپسند۔۔۔ لیکن اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے اس طرح کے روپ میں دیکھے گا۔ اُس روپ میں جس میں اُس نے کبھی اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ وہ عورت اُسکی بیوی ہی تھی، رضا کو اُسکا چہرہ یاد آ گیا تھا۔ اور وہ بچہ؟ یقیناً وہ اُسکا بیٹا تھا۔

یہ اُسکی آنکھوں میں چھپا خوف نہیں تھا جس نے رضا کے دل میں آگ لگائی تھی، یہ اُسکی آنکھوں میں نظر آتی نفرت تھی، جس نے اُسے حیران کیا تھا۔ اُس نے اس بچے کی آنکھوں میں وہی نفرت دیکھی تھی، جو اپنے باپ کے لیے اُسکی آنکھوں میں ہوا کرتی تھی۔

آج اُسے علی پر غصّہ نہیں ترس آیا تھا۔ کیا بن گیا تھا وہ؟ وہ کیوں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اُسکے حصے میں بھی اولاد کی نفرت آ رہی ہے؟

ایک اور گھر وہی بن گیا تھا یا بننے جا رہا تھا؟ کیا وہ بچہ بھی رضا جیسی قسمت پائے گا؟ کیا اُسکا مستقبل بھی اُسکے جیسا ہو گا؟ دنیا کے دکھوں میں بچوں کا حصّہ نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ رضا نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہی بنایا تھا کہ کوئی بچہ اُسکے جیسا بچپن نہ گزارے۔ اور اب ایک بچہ اُسکے سامنے تھا لیکن وہ اُسکے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بے بسی کا احساس رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹے ٹکروں سے بھر گیا تھا۔ وہ سگریٹ بہت پیتا تھا، کبھی سڑک پر کبھی اپنے فلیٹ پر، لیکن اسکول، یونیورسٹی اور پناہ گاہ میں وہ مر کر بھی اسکا تصوّر نہیں کرتا تھا۔

ایک آگ سی اُسکے اندر بھر گئی تھی، ساتھ ہی وہ لوگ یاد آئے جو اُسکی زندگی جہنّم بنانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے اُس نے ایک فیصلہ کیا اور اپنا موبائل باہر نکالا۔۔۔

جو فیصلہ اُس نے کیا تھا، وہ اُسکی نفرت کی انتہا تھی۔ اور اس نفرت میں وہ سب کو جلا کر راکھ کرنے والا تھا۔۔۔۔

----------+---------+--------

رات ٹھنڈ اچانک سے بڑھ گئی تھی، جیکٹ کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے مقدّم نے بیل پر ہاتھ رکھا تو ہٹانا جیسے بھول گیا۔ دروازے کی کنڈی کھولنے کی آواز آئی تو اُس نے بیل سے ہاتھ ہٹایا۔

''سردی دماغ پر لگ گئی ہے؟'' جسکا صبح سے انتظار تھا، دروازہ اُسی نے کھولا تھا۔ اُسے دیکھ کر جہاں مقدّم کے چہرے پر خوشگوار حیرت اُبھری تھی، وہیں اُسکے چہرے پر خفگی در آئی۔

''باہر واقعی سردی بہت ہے۔''اُس نے جتایا، دوسرے لفظوں میں کہا کہ میں تو جم جاؤں گا لہٰذا مجھے اندر آنے دیا جائے۔

''ہاں! سردی تو ہے، تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرواؤں گی۔ ابھی لیکر آتی ہوں مکرم کو۔'' وہ اُسے ہکا بکا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

''بھاڑ میں گئی اخلاقیات۔۔۔'' وہ سارے اخلاق بالائے طاق رکھتے ہوئے اندر آ گیا۔ ویسے انتہائی نامعقول حرکت تھی لیکن صد شکر کے صحن میں ہی نانی مل گئی۔

''ارے بیٹا تم۔۔۔ مقدّس نے بتایا ہی نہیں کہ تم آئے ہو۔'' وہ اُسکے پاس آئیں۔

''آپ اتنی سردی میں صحن میں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ اس بوڑھی خاتون کو اتنی ٹھنڈ میں صحن میں بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

''موسم انجوائے کر رہی تھی۔ خیر چھوڑو اس بات کو، تم اندر آؤ'' اُسکا ہاتھ پکڑ کر اسے لاؤنج میں ہی لے آئیں۔ وہ اس بوڑھی خاتون کی زندہ دلی پر حیران تھا۔

''آج تو تم چائے پی کر ہی جاؤ گے۔'' اُسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ قریب ہی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ایک خوش اخلاق سا مرد بیٹھا تھا۔ اُسکے سر پر ایک بھی بال نہ تھا، بلکل صاف شفاف کسی چٹان جیسا سر۔۔۔ مقدّم کو دیکھ کر مسکرایا تو اس نے بھی سلام جھاڑا۔

''چائے کی ضرورت نہیں ہے نانی! میں بس مکرم کو لے کر نکلوں گا۔'' اُس نے معذرت کرنی چاہی، اُسی لمحے مکرم کو گود میں لیے مقدّس بھی وہیں آئی تھی۔ اُسے دیکھ کر ٹھٹکی، پھر رکی۔ یہ نانی بھی ناں!

''ارے ایسے کیسے؟ مقدّس بنائے گی چائے، اور تمہیں پینی پڑے گی۔'' یہ جواب اُس گنجے صاحب نے دیا تھا۔

''آپ کا تعارف؟'' اُس نے ادب سے پوچھا۔

''میں مقدس کا ماموں۔۔۔'' اُنہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے! آپ وہی ماموں ہیں؟'' حیران ہوتے ہوئے کہا (جو طلاق یافتہ ہیں؟)۔

''وہی مطلب؟'' وہ سمجھے نہیں۔

''وہی مطلب۔۔۔'' وہ گڑبڑایا۔

''مقدّس نے میرے بارے میں کچھ ایسا ویسا بتایا ہے؟'' وہ مشکوک ہوئے۔

''نہیں نہیں! میں نے کچھ نہیں بتایا۔'' اُسکی حالت سے لطف اندوز ہوتے مقدّس نے فوراً وضاحت دی۔

''اگر مقدّس پلائے گی تو میں چائے پینے کو تیار ہوں۔'' اُس نے فوراً سے کہا اور ٹک کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جتنی دیر وہ چائے بناتی رہی، اُسے گھورتی رہی۔۔۔ اتنی دیر اُسکے ماموں مقدّم کو کمپنی دیتے رہے۔ اچھے خوش اخلاق لوگ تھے سب ہی۔

''چائے۔۔۔'' اُسکے سامنے کپ رکھا اور نیچے قالین پر مکرم کے ساتھ بیٹھ گئی۔ نانی نجانے کہاں چلی گئی تھیں؟ ماموں کچھ دیر بیٹھے رہے پھر اُنکے پاس کسی کی کال آئی تو وہیں بیٹھے بیٹھے فون پر بات کرنے لگے۔ ایسے ہنس ہنس کر، اور چلا چلا کر بات کر رہے تھے جیسے وہاں اکیلے بیٹھے ہوں۔ کئی بار تو مقدّم کو کانوں پر ہاتھ رکھنے پڑے۔

''تم سب کیا ایسے ہی ہو؟'' اُس نے پریشان ہو کر مقدّس سے پوچھا۔

''ایسے سے تمہاری مراد؟'' بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''ایسے یعنی تھوڑے عجیب سے۔۔۔'' سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''اور تم بھی ہمیشہ سے ایسے ہی ہو؟'' اُسی کے انداز میں پوچھا گیا۔

''ایسے سے تمہاری مراد؟'' اُس نے بھی اسی کے انداز میں پوچھا۔

''ایسے یعنی پورے عجیب سے۔'' اب کہ وہ اپنی ہنسی نہیں روک سکا۔

''کیا عجیب حرکت کی میں نے؟'' مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جو مشکوک حرکتیں تم کر رہے ہو، عجیب نہ کہوں تو کیا کہوں؟''

''مشکوک؟'' وہ حیران ہوا۔

''اُس دن خون آلود شرٹ کے ساتھ گھر آئے، آج صبح مجھے الٹے سیدھے میسیج کر رہے تھے۔''

''الٹے سیدھے؟''تڑپ کر اُسے دیکھا۔اُسکے انداز پر مقدّس نے مسکراہٹ دبائی۔

''شکریہ کا میسیج تھا بس!''چبا چبا کر کہا۔

''ہاں تو؟ ویسے تو میرے کسی میسیج کا جواب نہیں دیتے۔ صرف ری ایکٹ کر دیتے ہو۔اور آج بلا وجہ ہی شکریہ لکھ کے بھیج رہے ہو۔''
بات معقول تھی۔

''وہ میسیج، میں اخلاق کو کر رہا تھا۔ غلطی سے تمہیں چلا گیا.''

''اچھا!''ذرا لمبا کھینچا۔''کس بات کا شکریہ ادا کر رہے تھے اُسکا؟''

''مکرم کی خالہ کو بھیجنے کا شکریہ کر رہا تھا''اُسکے جواب پر وہ ٹھہری۔۔۔اور ٹھہری ہی رہ گئی۔وہ چائے پیتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''یہ شکریہ تم مجھے بھی کہہ سکتے ہو۔''جتایا گیا۔

''تمہیں کس لیے شکریہ؟ تم تو خالہ ہو، تمہاری تو ذمے داری ہے۔''اُسی کی بات اُسی کو یاد دلائی۔

''بد تمیز۔۔۔''جل کے سوچا اور رخ پھیر لیا۔

''کیا بات ہو رہی ہے؟''ماموں نے فون رکھتے ہوئے اُن دونوں کو دیکھا۔

''میں مقدّم کو بتا رہی تھی کہ اگلے ہفتے آپکی شادی ہے۔''اُس نے بتایا تو جوابا ًماموں ایسے شرمائے کہ اُنکی چمکتی ٹنڈ بھی لال ہو گئی۔

''ارے ماشاءاللہ! مبارک ہو۔ کہیں پڑوسن سے تو نہیں کر رہے شادی؟''پورے دس سال بات آج مقدّم کی زبان ویسے ہی پھسلی تھی، جو کسی زمانے میں اُسکا خاصا تھی۔اس بات پر ماموں نے آنکھیں پھاڑ کے اُسے دیکھا تھا۔ یکدم ہی اُسے احساس ہوا کہ شاید اس نے کچھ غلط بول دیا ہے۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی وضاحت دیتا ماموں بول اٹھے۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''اب کہ حیران ہونے کی باری مقدّم کی تھی۔

''اس نے بتایا نہ سب؟'' مقدّس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''ماموں میں سوچ رہی ہوں کہ مکرم کی شاپنگ بھی کل کر لوں۔ آخر کو یہ شہہ بالا بنے گا نہ؟'' اُس نے صاف بات بدلی۔

''کیا مطلب مکرم بھی شادی میں جائیگا؟'' وہ مزید حیرت سے بولا۔

''صرف مکرم کیوں؟ اُسکا باپ بھی جائیگا۔'' نانی پتہ نہیں کہاں سے نمودار ہوئی تھیں۔

''نہیں نانی! میرا آنا تو مشکل ہو جائیگا۔'' وہ پریشان ہوا۔

''آنا تو پڑیگا، اور شاپنگ کے لیے کل تم مقدّس کو لے جاؤ گے؟ اصل میں مجھے اپنی منگیتر کے ساتھ جانا ہے۔'' اُنہوں نے شرمانے کی انتہا کر دی۔ مقدّس آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنہیں منع کرنے لگی، لیکن وہ اُسکی سنتے کہاں تھے؟

''اسے ابھی یہاں کے بارے میں اتنا معلوم نہیں ہے، تم ساتھ جاؤ گے تو ہمیں بھی تسلی رہے گی۔'' نانی نے بھی کہا۔

''ٹھیک ہے! میں کل آفس سے جلدی آجاؤں گا'' اُس نے حامی بھر لی۔ مقدّس نے شرمندہ ہو کر اُسے دیکھا لیکن وہ کچھ پریشان سامیز کی جانب دیکھ رہا تھا۔

----------+---------+--------

دو راتیں، دو دن۔۔۔ کیسے گزرے اُسے معلوم نہ ہوا۔ پوری رات سڑکوں پر گزار کر جب وہ گھر واپس آیا تو گھر خالی تھا۔ اُسکی زندگی بھی خالی اور اُسکا دل بھی خالی۔۔۔

سارا دن وہ سڑکوں پر احمد کو یاد کرتا رہا، کبھی وہ سائیکل چلاتا نظر آتا، کبھی ننھے قدموں سے اُسکی جانب آتا احمد یاد آتا۔ وہ کبھی اُسے گلے نہیں لگا سکا، کبھی اُسے پیار نہیں کر سکا۔ اب دل کر رہا تھا کہ وہ سامنے آجائے تو اُسے گلے لگا لے۔

دو روز سے سڑکوں پر گھومتے اُسے کئی بار خیال آیا کہ اُس نے احمد کو فاطمہ کے حوالے کیسے کر دیا؟ وہ تو اپنے مقصد کے لیے اُسکی اولاد کو قتل کر چکی تھی، تو کیا معلوم اب بھی اُسکا کوئی مقصد ہو؟ یہ خیال دل میں آیا تو اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہونے لگا، کیوں احمد کو اُسکے ساتھ جانے دیا؟

جب برداشت جواب دے گئی تو گھر آ کر سفیر صاحب سے فاطمہ کے نمبر پر رابطہ کروایا۔ احمد سے بات کروانے کو کہا تو کافی دیر تک وہ لائن پر نہیں آیا۔ جب وہ لائن پر آیا تو علی کچھ بول نہیں سکا، کتنی ہی دیر ضبط کیے کھڑا رہا۔ پھر کافی دیر بعد بولا تو آواز بھرا گئی۔

''گھر آ جاؤ بیٹا!'' آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''مجھے آپکے ساتھ نہیں رہنا۔ آپ گندے ہیں۔'' اُس کے دل پر کسی نے آرا چلا دیا۔ اس سے زیادہ وہ نہیں سن سکا اور فون رکھ دیا۔

اُسکے بعد وہ اپنے کمرے میں جو بند ہوا تو پھر باہر ہی نہ آیا۔ سفیر صاحب دروازہ پیٹتے رہے لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلآخر پریشان ہو کر اُنہوں نے لاک تڑوا دیا۔ وہ شدید بخار میں تپ رہا تھا، حالت ایسی تھی جیسے ابھی سانسیں رک جائیں گی۔ اُنہوں نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلوایا۔

''شدید اسٹریس اور مسلسل بھوکے پیاسے رہنے کی وجہ سے انکی یہ حالت ہوئی ہے۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ آپ نے صرف انکے ہوش میں آتے ہی انہیں کچھ کھلانا پلانا ہے۔'' ڈاکٹر ہدایت دے کر چلا گیا۔ سفیر صاحب ساری رات ڈرپ سے قطرہ قطرہ گرتے انجکشن کو دیکھتے رہے تھے۔

صبح جا کر اُسے ہوش آیا تھا، بخار بھی کچھ کم ہوا تو سفیر صاحب اُسکے لیے دلیہ لے آئیں۔ سوچا تھا کہ وہ یقیناً کھانا اٹھا کے پھینک دے گا۔ لیکن خلاف توقع اُس نے خاموشی سے کھانا کھا لیا۔

''میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب ہو۔'' اُسے خاموش دیکھ کر اُنہوں نے کہا۔

''میں بات نہیں کرنا چاہتا۔'' اُس نے آہستگی سے کہا تو وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر مزید گزرے، پھر وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔ زندگی سے ہر وہ شخص دور ہو گیا تھا، جسے اُس نے بے انتہا چاہا تھا۔

اسی طرح دوپہر گزری، پھر رات بھی آ گئی۔ اس بار سفیر صاحب نے ملازم کے ہاتھوں کھانا بھیج دیا، خود اُسکا سامنا کرنے سے گریز کیا تھا۔ رات اُسکی حالت کچھ خراب ہوئی تھی۔ جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں، کروٹ تک لینا محال ہو رہا تھا۔ لیکن اُس نے کسی کو نہیں بلایا، کسی کو آواز نہ دی۔ اپنے آپ سے جتنی نفرت کر سکتا تھا اس وقت کر رہا تھا۔

احمد کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی بھلائے نہیں بھول رہی تھی۔اب کس کے لیے اتنی محنت کرے؟ کس کے لیے پیسے کمائے؟اُسکا مستقبل کیا تھا بھلا اب؟اکیلے انسان کی کیا خواہش ہوتی ہے؟ جب ضبط جواب دے گیا تو پاس رکھا تکیہ اٹھا کے چہرے پر رکھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اُسکے دروازے پر خاموشی سے کھڑے سفیر صاحب بے بسی سے واپس چلے گئے۔اُنہوں نے علی کو ایسے کبھی نہیں دیکھا تھا،وہ کبھی نہیں روتا تھا۔ لیکن اس بار وہ بری طرح ٹوٹا تھا۔وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ایسا ہو گیا تھا،کاش وہ ایک بار فاطمہ کی بات سن لیتا۔گھر تو جیسے قبرستان بن گیا۔

وہ دن اور اُسکا اگلا دن بھی ایسے ہی گزر گیا۔ سفیر صاحب پورے گھر میں بولائے بولائے پھرتے رہے۔ علی بستر کو لگ گیا تھا اور یہ بات اب اُنکی جان پر بن رہی تھی۔

جب تیسرا دن آیا تو عمر بھی پریشان ہو گیا۔ دو دن سے نہ علی آفس آیا تھا نہ اُس نے اُسکا فون اٹھایا تھا اور نہ ہی اُسکے میسیج دیکھے تھے۔ایسا پہلی بار ہوا تھا،ورنہ وہ ہمیشہ اُسے بتا دیا کرتا تھا۔

”کہیں وہ اس روز والی بات کا برا تو نہیں مان گیا؟“ دل میں خیال آیا۔اور یہی سچ بھی لگا۔

”لیکن آفس تو آنا چاہیے۔“ کچھ سوچ کر موبائل نکالا اور اُسکے گھر کے لینڈ لائن پر کال کی۔ یہ نمبر علی نے ہی دیا تھا کہ کبھی ضرورت کی صورت میں وہ فون نہ اٹھائے تو اس نمبر پر کال کر لے۔ صرف آفس کی ضرورت۔۔۔

دو سالوں میں آج پہلی بار عمر نے اس نمبر پر فون کیا تھا۔ کافی دیر بیل جاتی رہی،جب اُسے لگا کہ فون بند ہو جائے گا تب ہی فون اٹھا لیا گیا۔

”ہیلو!۔۔۔“ فون سفیر صاحب نے اٹھایا تھا۔

”السلام علیکم انکل! میں عمر بات کر رہا ہوں۔ علی کے آفس سے۔۔۔“ اُس نے تعارف کروانا مناسب سمجھا۔

”عمر! تم علی کے یونیورسٹی کے دوست ہو نا؟“ وہ حیران ہوا۔اُنہیں وہ یاد تھا؟

”جی انکل! میں وہی ہوں۔ علی سے بات ہو سکتی ہے؟“

”علی بہت بیمار ہے بیٹا،دو دن سے“

''اوہ! سب خیریت؟''

''شدید بخار ہے اُسے، کمزوری اتنی ہے کہ بستر سے اُٹھ بھی نہیں پارہا۔''

''ایسے اچانک بیمار کیسے ہوا؟ ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''دیکھایا تھا بیٹا! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اُسے شدید اسٹریس ہے۔'' وہ ساکت رہ گیا۔ کیا اُسکی بات کا اتنا اثر لے لیا تھا اُس نے؟ کیا یہ سب اُسکی وجہ سے ہوا تھا؟ بھلا اسٹریس کی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ اُسکو شرمندگی نے آگھیرا۔

''تم اُسکے پرانے دوست ہو، اُس سے بات کرو، اُسے سمجھاؤ۔ میری تو کوئی بات ہی نہیں سنتا'' وہ اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

''سمجھاؤں؟ کیا سمجھانا ہے اُسے؟ کس بارے میں؟'' وہ محتاط ہوا۔

''اُس نے تمھیں نہیں بتایا؟'' وہ حیران ہوئے۔ وہ بیچارے اُسے ابھی بھی علی کا دوست ہی سمجھ رہے تھے۔

''میں آپکی بات نہیں سمجھ سکا۔ آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں؟'' اس نے نپے تلے الفاظ میں سوال کیا تاکہ انکو شک نہ ہو۔

''فاطمہ اور علی کی چار سال پہلے طلاق ہو گئی تھی۔ دونوں کا بیٹا احمد، وہ ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ تین دن پہلے ہی وہ فاطمہ کے ساتھ چلا گیا ہے۔'' عمر کا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ علی کی طلاق ہو گئی؟ کب اور کیسے؟ سفیر صاحب بہت کچھ بتا رہے تھے۔ لیکن اُسکا دماغ لفظ طلاق پر اٹک گیا تھا۔ جب کافی دیر بعد کچھ کہنے کے قابل ہوا تو پوچھا۔

''کیا وہ اُسے زبردستی لے گئی ہے؟'' اُسے عمارہ یاد آئی۔۔۔ کیا ساری عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں؟

''نہیں! احمد خود ہی گیا ہے اُسکے ساتھ۔۔۔ لیکن بیٹا! علی تب سے کمرے میں بند ہے۔ کسی سے بات نہیں کر رہا، کچھ کھا پی بھی نہیں رہا۔ بہت دل دکھا ہے اُسکا بیٹا! بہت زیادہ۔۔۔ تم آجاؤ کچھ دیر، اُسکے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں نے تو تین دن سے اُسکی آواز بھی نہیں سنی۔'' وہ رو دیے تھے۔ اُسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔

علی پریشان تھا، یہ بات وہ جانتا تھا۔ لیکن پریشانی کی نوعیت اتنی شدید ہو گی اُسے معلوم نہ تھا۔ کاش ! کہ اُسے معلوم ہوتا، وہ کچھ دن رک جاتا، بعد میں سمجھا دیتا اُسے۔۔۔ پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیا تھا اُس روز؟ اب اُسے شدت سے افسوس ہو رہا تھا۔ گھر ٹوٹنا چھوٹی بات نہیں ہوتی، انسان ختم ہو جاتا ہے۔ اوپر سے اُسکا بیٹا بھی اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا حالت ہو گی اُسکی؟

''میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں انکل ! آپ پریشان نہ ہوں۔''

''اُسے بتانا مت کہ میں نے تمہیں آنے کو کہا ہے۔'' اُنہوں نے کچھ سمجھانا چاہا۔

''ٹھیک ہے آپ پریشان نہ ہوں۔'' اُس نے اُنہیں تسلی دے کر فون رکھ دیا۔

لیلیٰ میری زندگی میں نہیں ہے۔

کچھ دن پہلے کے مقدّم کے کہے الفاظ اُسکے کانوں میں گونجے۔ وہ لیلیٰ کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا لیکن نوید والے واقعے کی وجہ سے وہ پوچھ نہیں سکا تھا۔

لیلیٰ مقدم کی زندگی میں نہیں تھی، علی کی طلاق ہو گئی تھی اور عمارہ اُسے چھوڑ گئی تھی۔ زندگی اُن سب پر اتنی ظالم کیوں ہو گئی تھی آخر؟

دوستی، انسانیت، رشتے۔۔۔ یہ سب بے معنی ہو چکے ہیں میرے لیے۔

علی کی ہر ہر بات کا مطلب اب سمجھ آ رہا تھا۔

تم لوگ کس دن میرے بارے میں ٹھیک سوچنا شروع کرو گے؟

اُسے اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ اتنا تلخ کیوں ہو گیا تھا؟ وہ اُسے کہتا رہا کہ تم رضا کی طرف کی کہانی جاننے کی کوشش کرو لیکن خود اُس نے کیا کیا؟ اُس نے بھی تو علی کو جاننے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اُسکا غصّہ رضا پر نہیں تھا، غصّہ فاطمہ پر بھی نہیں تھا۔ غصّہ زمانے پر تھا، زندگی پر تھا، قسمت پر تھا۔ پوری دنیا پر تھا۔

کاش ! وہ اُسے سمجھنے کی کوشش کرتا۔

----------+---------+--------

جسم شدید دکھ رہا تھا، لیکن اس حالت میں بھی وہ سو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر سو یا رہا؟ جب سر کا درد بڑھنے لگا تو آنکھیں خود بہ خود کھل گئیں۔ بستر سے اٹھنے کی کوشش میں کراہ اٹھا۔

''آرام سے۔۔۔'' کسی نے سہارا دے کر اُسے بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ حیران نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ عمر تھا۔

''تم؟۔۔۔''

''میں بنا بتائے آگیا، معذرت!'' اُس نے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ نہ جانے وہ کب سے یہاں تھا؟

''نہیں! کوئی بات نہیں۔۔۔'' تکلیف آواز سے بھی جھلکتی تھی۔

''میری غیر موجودگی میں تمہیں پریشانی اٹھانی پڑی ہوگی۔'' علی نے بات کا آغاز خود ہی کیا۔

''نہیں! بلکہ میں تمہارے اس طرح اچانک غائب ہونے پر پریشان تھا۔ اسی لیے ملنے چلا آیا۔'' جواباً وہ خاموش رہا۔

''ابھی کیسی طبیعت ہے؟'' اُس نے علی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تین روز میں، اُس میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے ہلکے پڑ گئے تھے، چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

''نارمل بخار ہے، ٹھیک ہو جائے گا کچھ روز تک۔۔۔'' اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے، تب تک آرام کرو۔ میں آفس دیکھ لوں گا''

''شکریہ!'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''علی!''

''ہاں؟'' سر اٹھا کے اُسے دیکھا۔

''اُس دِن میں نے جو بھی کہا، اسکے لیے میں شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا'' وہ اپنی طرف سے اُسکی تکلیف کم کرنا چاہتا تھا۔

''میں اس بارے میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''ہاں! ہم کرینگے۔ لیکن۔۔۔'' اُسے سمجھ نہیں آیا کہ اُسے کیسے تسلی دے؟ کیا کہے؟ کیا نہ کہے؟ اور کہے بھی تو کیسے؟

''لیکن؟۔۔۔'' علی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کچھ نہیں! تم آرام کرو، میں چلتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہوا۔

''خدا حافظ!'' وہ چلا گیا۔ علی اُسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ یقیناً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا تھا۔ اُس نے بھی اُسے نہیں روکا، اس وقت وہ کچھ بھی نہ سننا چاہتا تھا نہ بات کرنا چاہتا تھا۔

پر۔۔۔

اُسے علی کی فکر ہوئی تھی۔ وہ اُسکے لیے آیا تھا، اُس سے ملنے آیا تھا۔ وہ مہربان دوست۔۔۔ آج بھی مہربان تھا۔ علی نے تھک کر سر تکیے پر گرادیا۔

-------+------------+--------

تین روز، پانچ دنوں میں اور پانچ روز ہفتے میں تبدیل ہوگئے۔ لیکن وہ آفس نہیں گیا۔ عمر نے بھی حتیٰ الامکان اُسے آفس کے معاملات سے دور رکھا ہوا تھا۔ بس کسی وقت میسیج کر کے اس سے حال احوال دریافت کر لیتا اور پھر اُسے آرام کرنے کی تلقین کر دیتا۔ بخار اب اُتر چکا تھا، لیکن کمزوری اپنی جگہ تھی۔ ایک ہفتے سے اپنے گھر میں بند رہ رہ کر تھک گیا تو باہر نکل گیا۔ گاڑی ساتھ لی نہ بائیک۔۔۔ ایسے ہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا تھا۔ سگریٹ پیتا رہا اور چلتا رہا، دل خالی تھا، دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ سردی ہونے کے باوجود فقط ایک شرٹ میں ہی وہ چلتا چلتا نہ جانے کہاں سے کہاں چلا آیا؟ ہوش تو تب آیا جب کسی گاڑی نے اُسکے قریب آ کر ہارن دیا۔ وہ رکا اور ایک کنارے ہوگیا لیکن گاڑی والا آگے نہیں بڑھا، بلکہ اسی طرح ہارن دیتا رہا۔ اب کہ علی نے بگڑ کر اُسے دیکھ، تو پہلے شناسائی، پھر حیرت اور پھر الجھن اُسکی آنکھوں میں یکے بعد دیگرے نمودار ہوئی تھیں۔ وہ حسین تھا۔ لیکن وہ اُسکے پیچھے کیا کر رہا تھا؟ اُس نے علی کی جانب کا شیشہ نیچے کیا۔

''کیا آپ اپنی رفتار کم کر سکتے ہیں؟ وہ کیا ہے نہ میری گاڑی میں اتنی سکت نہیں ہے۔۔۔ بیچاری آپکے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل نہیں پا رہی۔''

''تو میں نے کہا ہے کہ میرے پیچھے آو؟ جاؤ اپنے راستے۔۔۔'' بداخلاقی کی تمام حدیں پار کرتے ہوئے علی نے اُسے جانے کا راستہ دکھایا اور پھر خود آگے بڑھ گیا۔ لیکن حسین بھی اپنے نام کا ڈھیٹ تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' گاڑی بڑھاتا پیچھے آیا۔

''جہنّم میں۔۔۔'' زہر لگ رہی تھی ساری دنیا اس وقت۔۔۔

''آؤ ساتھ چلتے ہیں۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' بلآخر تھک کے پوچھا۔

''تمہیں گھر ڈراپ کر دوں، یا جہاں تم جانا چاہو؟'' اس مرتبہ اس نے نرمی سے کہا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

''آجاؤ اندر، اغوا نہیں کروں گا تمہیں۔'' اُسکی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو ناچار بیٹھ گیا۔ جانتا تھا وہ پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ حسین نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ خاموشی سے باہر دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں آج کل اُسکے بچھڑے دوستوں کو اُسکی اتنی زیادہ فکر کیوں ہونے لگی تھی؟ کبھی نوید تو کبھی عمر اور اب حسین۔ جتنا اُن میں سے کسی کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا، اتنا وہ لوگ پتہ نہیں کہاں کہاں سے نکل کر آ رہے تھے؟

''جہنّم کا راستہ مجھے معلوم نہیں ہے، اگر گھر کا راستہ بتا دو تو وہیں ڈراپ کر دوں۔'' خاموشی کو حسین کی آواز نے توڑا، وہ اپنی بیساختہ اُمڈتی مسکراہٹ کو روک نہیں سکا۔

''سیدھا چلتے رہو بتا دوں گا۔'' چہرے پر دوبارہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اُس دن جو میں نے کہا اُس کے لیے میں معذرت کرتا ہوں۔'' حسین نے یکدم ہی کہا۔

''یہ آج کل تم لوگوں کو معذرت کرنے کا نیا دورہ پڑا ہے؟'' اُس نے کافی سنجیدگی سے پوچھا۔

''میرے علاوہ کس نے معذرت کر لی تم سے؟'' وہ حیران ہوا۔ جواباً وہ خاموش ہی رہا۔ ایک بار پھر سے گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

''یہاں سے بائیں۔۔۔'' کافی دیر بعد اُس نے کہا تو سر ہلاتے بائیں جانب گاڑی موڑ دی۔

''ایک بات پوچھوں تم سے؟'' اُس نے علی کو مخاطب کیا۔

''تم اجازت کب لیتے ہو؟''اُسکے کے جواب پر وہ ہنس پڑا۔ رضا نے بھی یہی کہا تھا۔اور گدھے سمجھتے تھے کہ دوستی ختم۔۔۔

''تم مجھ سے کس بات پر ناراض ہو؟''سوال غیر متوقع تھا۔

''میں تم سے کیوں ناراض ہوں گا؟ بھلا میں ہوں ہی کون ناراض ہونے والا؟''جواب غیر متوقع بلکل نہیں تھا۔

''ایسے ڈائیلاگ میری بیوی کے بڑے پسندیدہ ہیں۔''اب کہ وہ چاہ کر بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہیں کر سکا تھا۔ یہ آدمی ماحول کو اپنے مطابق ڈھالنے میں ماہر تھا۔اُس نے اچانک ہی گاڑی روک دی تو علی نے سوالیہ نظروں سے حسین کو دیکھا۔ وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ گاڑی کیوں روک دی؟''نا سمجھی سے پوچھا۔

''میں نے تو تمہیں نہیں چھوڑا تھا علی!۔۔۔ میں تو آیا تھا۔ آخری پیشی پر میں آیا تھا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ پھر تم مجھ سے کیوں خفا ہو اتنے سالوں سے؟''علی ساکت ہو گیا۔ وہ شکوہ کر رہا تھا؟ یا وضاحت دے رہا تھا؟ لیکن وہ ماضی ادھیڑ رہا تھا۔

''کیس اُس روز ختم نہ ہوتا تو میں تب تک تمہارا ساتھ دیتا جب تک وہ کیس چلتا۔''وہ درست کہہ رہا تھا۔ علی خاموشی سے اُسے دیکھے گیا۔ کیوں تھا وہ ایسا؟ ایک ہی جست میں سارے فاصلے مٹاتا تھا، دل میں آتا تھا اور آباد ہو جاتا تھا، نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ کہ وہ حسین تھا۔

''چھوڑ کے تو تم لوگ گئے تھے مجھے۔ میں نے تو کسی سے جھگڑا نہیں کیا تھا اُس روز، میں نے تو کسی کو کوئی الزام نہیں دیا تھا۔ پر اکیلا تو مجھے کیا تھا تم لوگوں نے؟ بتاؤ میرا کیا قصور تھا؟''اگر حسین شکوہ کر رہا تھا تو اُسکے لہجے میں نفرت، غصّہ یا ناراضگی کیوں نہ تھی؟ وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے کچھ سمجھانا چاہتا ہو۔ علی نے نظریں ونڈ سکرین پر جما دیں۔ اُسکے کسی سوال کا جواب نہیں تھا اُسکے پاس، اُس نے اِس رخ پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

''تم باتوں کو دل میں کیوں رکھتے ہو علی؟ مجھے دیکھو، میں نے تو کسی بات کا شکوہ نہیں کیا۔ تم کیوں نہیں بھول جاتے؟ مان کیوں نہیں لیتے جو ہو گیا اُسے اب بدلا نہیں جا سکتا۔''وہ جیسے اُسکا دماغ پڑھ رہا تھا۔

''تم لوگ کیوں بار بار دس سال پہلے پہنچ جاتے ہو؟ آج کی۔۔۔ابھی کی بات کیوں نہیں کرتے؟ کیوں پرانی باتیں نکالتے ہو؟'' وہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔

''لوگ؟ اب تم بتا ہی دو کہ میرے علاوہ اور کس نے یہ سب باتیں کی ہیں؟'' اُس نے چڑ کے پوچھا۔

''تم سب وہی باتیں کرتے ہو، جس سے بھی ملاقات ہوتی ہے وہ بات وہیں سے شروع کرتا ہے۔'' اُس نے اب بھی نہیں بتایا۔

''تو ہم اور کس بارے میں بات کریں گے علی؟'' حسین نے اُسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

''ہم چھ لوگ آخری بار جس نوٹ پر الگ ہوئے تھے۔ زندگی بے شک نہیں رکی تھی، لیکن ہماری دوستی کو وہاں پاؤز لگ گیا تھا۔ اب چاہے ہم ابھی ملیں یا مزید دس سال بعد، بات وہیں سے شروع ہو گی جہاں پر رکی تھی۔ ہم چاہے جتنی بھی کوشش کریں، بات دس سال پہلے ہی جائیگی، اور تب تک۔۔۔ جب تک ہم اُس مسئلے کو حل نہیں کر لیتے۔ کیوں کہ تم مانو یا نہ مانو، ایک دہائی پہلے ہوا وہ مسئلہ آج بھی غیر حل شدہ ہے۔ اور جب تک مسئلہ حل نہ کیا جائے وہ ختم نہیں ہوتا۔'' وہ بہت کچھ سمجھا چکا تھا۔ علی کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

''کیا تم مجھے گھر چھوڑو گے؟'' اُس نے بیزاری سے پوچھا۔

''نہیں!''

''کیا مطلب نہیں؟''

''گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔''

''کیا؟ کب؟''

''جب میں نے گاڑی روکی تھی۔'' اُس نے مزے سے کہا۔

''مجھے لگا کہ تم نے مجھ سے بات کرنے کے لیے گاڑی روکی ہے۔'' وہ تلملا گیا۔

''اب ایسے بھی اہم نہیں ہو تم کہ گاڑی روک کر بات کرتا میں۔'' علی اُسے گھورتا ہوا سیٹ بیلٹ کھولنے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ رکو!'' اُسکا بازو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُسے روکا اور اگلے ہی لمحے چونک اٹھا۔

"تمہیں بخار ہو رہا ہے؟" اُس نے اُسکے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"موسمی بخار ہے۔"

"یہ رہائشی علاقہ ہے، پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ملے گی یہاں پر، نیٹ ورک بھی ٹھیک نہیں آرہا یہاں، تو آنلائن ٹیکسی بھی نہیں آئے گی۔ اس لیے چپ کر کے بیٹھو میں ٹائر لگا رہا ہوں۔" اُسے ڈانٹنے والے انداز میں کہتا وہ ٹائر لگانے اُتر گیا۔

کبھی علی نوید سے، تو کبھی نوید رضا سے، کبھی عمر علی سے، تو کبھی مقدّم عمر سے، کبھی حسین رضا سے اور کبھی علی سے۔۔۔

شکوے، شکایتیں، ناراضگیاں، حکایتیں۔۔۔

دل کی باتیں۔۔۔

کچھ دل میں کچھ زبان پہ۔۔۔

تعلقات جڑنے لگیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ پرانی باتیں نکلتی ہیں۔ وضاحتیں بھی ہوتی ہیں، ناراضگیاں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی مناتا ہے تو کوئی روٹھا رہتا ہے۔ کوئی غلط فہمیوں کا شکار ہوتا ہے تو کوئی اُسکے مداوے کے لیے آتا ہے۔

انہی دائروں میں وہ لوگ پچھلے دو ماہ سے گھوم رہے تھے۔ آگے کیا ہونا تھا؟

اسکا فیصلہ قسمت کے ہاتھوں میں تھا۔

----------+---------+--------

(جاری ہے)

نحل کی آٹھویں قسط اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو میری پیج اور ویبسائٹ پر پوسٹ کی جائے گی۔ ان شاءاللہ